طلوعِ اسلام

December 41

یادگارِ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتّبہ	بدل اشتراک	
اخوندزادہ حسین امام	سالانہ	5/- پانچ روپیہ
	ششماہی	3/- تین روپے
جلد ( ) شمارہ ( )	فی پرچہ	آٹھ آنے

December 1941

فہرست مضامین

1	شاہ ولی اللہ اور قرآن و حدیث	page 1
2	نقد و نظر	page 21
3	نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم	Page 25
4	لمعات	page 42
5	بے حسی	Page 53
6	طرحِ نو	Page 56
7	"حقائق و عبر"	Page 57
8	جوئے رواں	Page 69

شاہ ولی اللہؒ اور قرآن و حدیث

جب کوئی قوم اپنے مرکز سے ہٹ جاتی ہے تو چونکہ اس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند مقصد نہیں رہتا اس لئے رفتہ رفتہ اس کے فکر و عمل کی قوتیں مضمحل ہوتی چلی جاتی ہیں اور بالآخر ان پر جمود و تعطل (سکنت) کا عذاب اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں حرکت باقی نہیں رہتی سہل انگاری کی زندگی ان کی فطرت ہو جاتی ہے نہ ذہن میں سوچنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے نہ دل میں کوئی ولولہ ۔ نہ بازوؤں میں قوتِ عمل ہوتی ہے نہ پاؤں میں چلنے کی ہمت ۔ اس سہل انگاری اور آرام پسندی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس ڈگر پر چلتے آ رہے تھے اسی پر چلے جا رہے ہیں ۔ قرآن کریم نے امم سابقہ کے احوال و کوائف سے بار بار اس طرف توجہ منعطف کرائی ہے کہ حق کی دعوت کو سب سے پہلے ہمیشہ ان لوگوں نے ٹھکرایا جن میں آرام طلبی اور سہل انگاری پیدا ہو چکی تھی ۔ انھوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ ہمیں سوچنے سمجھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہمارے آباء و اجداد جس روش پر چلے آ رہے تھے وہی روش ہم نے اختیار کر رکھی ہے ۔ اب اس میں تبدیلی پیدا کرنا گویا راہ راست سے ہٹ کر گمراہی اختیار کرنا ہے، حالانکہ ان کا تجزیہ نفس کیا جائے تو یہ حقیقت فوراً سامنے آ جائے کہ وہ آباء و اجداد کی روش سے اسلئے نہیں ہٹنا چاہتے تھے کہ ان میں جمود و تعطل آ چکا تھا ۔ وہ اس قدر آرام طلب ہو چکے تھے کہ جہاں بیٹھ گئے تھے وہاں سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا ۔ اسی سہل انگاری کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے "حصول نجات" کے لئے بھی بڑی بڑی آسان راہیں وضع کر رکھی تھیں ۔ ذرا غور فرمائیے ۔ اگر ایک شخص یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ اپنے مکان کے ایک گوشے میں نرم و نازک قالین کے مصلے پر بیٹھ کر ۔ اس سردیوں کے موسم میں ، نہایت نفیس و لطیف شال اوڑھے ادھر ادھر تکیے لگائے آتشدان میں آگ سلگائے اور آگ میں لوبان چھڑکائے تسبیح کے دانوں پر چند الفاظ دہرا لینے سے سیدھا جنّت میں پہنچ سکتا ہے ۔ تو وہ بھلا ایسے شخص کی آواز پر کیسے کان دھر سکتا ہے جو یہ کہے کہ جنت کا راستہ یہ نہیں جنت کی راہ اللہ کا نام بلند کرنے کے لئے بیوی بچے ۔ گھر بار یہ تمام عیش و عشرت کے سامان چھوڑ کر ۔ کوہ و دشت و بیاباں میں سرگرداں پھرنا ۔ بھوک اور پیاس کی مشقتیں برداشت کرنا اور پھر عند الضرورت جان جیسی متاعِ عزیز قربان کر دینا ہے ۔ یہ مثال جسمانی سہل انگاری کی ہے ۔ اسی طرح ذہنی سہل انگاری کی

کیفیت ہے۔ جو یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ علم کی تکمیل ان چند کتابوں کے ازبر کرلینے میں ہے جو آج سے کچھ عرصہ پہلے اسلاف نے لکھدی ہوں اور ان پر کسی قسم کا اضافہ یا تنقید گناہِ عظیم ہے وہ اس شخص کی کیوں سنے جس کی پکار یہ ہو کہ صحیح علم اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لانے سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے لئے عمر بھر کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی ضروری ہے اس کی ذہنی سہل انگاری اسے اس طرف آنے کی اجازت ہی نہ دے گی۔ لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کریگا کہ وہ سہل انگاری اور آرام طلبی کی وجہ سے اس طرف نہیں آتا۔ نفس انسانی بڑا حیلہ تراش واقعہ ہوا ہے۔ وہ یہ کہکر فریب دے گا کہ نہیں! حق کی راہ وہی ہے جس پر میں چل رہا ہوں اور اس کی سند یہ ہے کہ میں نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی راہ پر چلتے دیکھا ہے۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۵/۱۰۴ (خواہ ان کے آباء و اجداد کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور وہ راہ راست پر بھی نہ ہوں)

مسلمانوں پر ایک عرصہ سے یہی جمود و تعطل مسلط ہے جس نے ان کے افکار و اعمال کی قوتوں کو یکسر بیکار کر رکھا ہے۔ اب ان کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ انھیں ان کے مرکز کی طرف دعوت دیتا ہے تو ان کے اربابِ سیادت اس سے گھبرا اٹھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے تاکہ ان کی نیند میں فرق نہ آنے پائے۔ پھر یہ لوگ اپنی ذہنی سہل انگاری کی وجہ سے دعوت دینے والے کے دعوے کا جواب بھی دلیل و ثبت سے نہیں دیتے بلکہ اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس پر ایک ایسا لیبل چسپاں کردیا جائے جس سے عوام مشتعل ہو جائیں اور یوں اسے نکو بنا دیا جائے۔ اگلے دنوں ہمارے ایک دوست نے اسی قسم کے "لیبل" کی ایک بڑی دلچسپ بات سنائی آج سے کچھ عرصہ پہلے جب جماعتِ اہل حدیث نے جہالت و توہم پرستی کی رسوماتِ قبیحہ کے خلاف آواز بلند کی تھی تو ان کے لئے "وہابی" کا لیبل وضع کیا گیا تھا اور عوام میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت "وہابی" ہوتا ہے۔ سرحد کے ایک گاؤں میں ایک ہندو دوکاندار تھا۔ ایک دفعہ مولوی صاحب اس سے کسی بات پر بگڑ بیٹھے اور اسے چیلنج دیدیا کہ دیکھ! میں تجھے کس طرح سیدھا کرتا ہوں جمعہ کی نماز میں مولوی صاحب نے اعلان کردیا کہ یہ دوکاندار "وہابی" ہوگیا ہے اس لئے اس سے کوئی مسلمان خرید و فروخت نہ کرے۔ بس پھر کیا تھا۔ چار ہی روز میں لالہ جی کے ہوش ٹھکانے لگ گئے اور اس نے مولوی صاحب کو راضی کر لیا۔ دوسرے جمعہ میں مولوی صاحب نے اعلان کردیا کہ اب خیر فضل ہے لالہ پھر دیوان (ہندو) ہوگیا ہے "وہابی" نہیں رہا۔ اب اس کا بائیکاٹ ختم ہوگیا۔ یہ ہے لیبل کا اثر۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر دور میں اس قسم کے لیبل وضع ہوتے چلے آئے ہیں آج اسی قسم کا ایک لیبل "منکرِ حدیث" کا ہے۔ (اور

ہمارا خیال ہے کہ علم النفس کی رُو سے اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس لیبل کے وضع کرنے میں اس جذبۂ انتقام کا بھی بڑا ہاتھ دکھائی دے گا جو وہابی" کے لیبل سے اس سے پیشتر پیدا ہو چکا تھا) اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ میں قرآن کریم کو دین کی مکمل کتاب مانتا ہوں یعنی میرا ایمان ہے کہ یہ صحیفۂ مقدس تکمیل شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمّل ضابطۂ حیات ہے نجات و سعادت کا یہی ایک ذریعہ ہے - اسی کتابِ عظیم پر حضور سرورِ کائنات (صلعم) نے عمل کیا اور اسی کے مطابق اس حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہوا جس میں اللہ کے یہ قوانین، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے عملاً نافذ ہوئے - تو چونکہ یہ آواز قوت و عمل کی طرف دعوت دینے والی آواز ہے - اس لئے سہل انگاری اور آرام طلبی نے فطرتی طور پر اس کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور اپنی عادتِ مستمرہ کے مطابق دلائل و براہین کے بجائے لیبل تراشی سے کام لیا - چنانچہ اس کے لئے "منکرِ حدیث" کا لیبل وضع کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کا فلیتہ چھوڑ دیا گیا اور اس کے بعد خود پھر اسی میٹھی نیند میں سو گئے جس میں مدتوں سے سوتے چلے آ رہے تھے۔ اس قسم کی "لیبل تراشی" جہاں ایک طرف ان لوگوں کے آرام و سکون (یعنی جمود و تعطل) میں خلل اندازی کے فتنے سے انھیں کچھ وقت کے لئے محفوظ کر دیتی ہے - دوسری طرف بہت سے بے علم مدعیانِ علم و دین کی جہالت کے لئے عارضی نقاب پوشی کا بھی کام دیتی ہے - کس قدر آسان ہے یہ کہہ دینا کہ یہ آواز اس لئے حق کی آواز نہیں کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اس کے خلاف ہے !

طلوعِ اسلام، مسلمانوں کو انسانوں کے بنائے ہوئے دین سے ہٹا کر اس دین کی طرف دعوت دینے کا مدعی ہے جو اللہ نے انسانوں کے لئے بنایا اور نبی اکرمؐ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچا - چونکہ یہ آواز مدتوں کے آرام طلب اور سہل انگار مسلمان کی نیند میں خلل اندازی کا موجب تھی - اسلئے اس پر بھی ایک لیبل لگ جانا ضروری تھا - وہی لیبل جو آج کل "منکرِ حدیث" کے نام سے معروف ہے - اربابِ سیادت نے یہ لیبل لگایا اور پھر اپنی گہری نیند میں سو گئے اور عوام سے کہہ گئے کہ ہاں ! ذرا ہوشیار رہنا - اس لیبل والا مسلمان بڑا خطرناک قسم کا ڈاکو ہوتا ہے - وہ تمہارے متاعِ ایمان و عقیدت کو جھپٹ کر لے جائے گا - اس کے قریب نہ پھٹکنا - ان اشتعال دلانے والوں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو دل میں اپنے مسلک کی کمزوری کو جانتے ہیں لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس کا علانیہ اعتراف نہیں کر سکتے - کچھ حسد و عداوت کی بنا پر - کچھ عوام کی طرف سے جھوٹی عزّت کی خاطر بعض اپنی سیادت کی مسند کو قائم رکھنے کے لئے - اور بعض معاشی مجبوریوں کی وجہ سے -

جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ یہ بالکل نئی نئی باتیں ہیں۔ ہم نے اپنے اسلاف میں تو کسی کے ہاں اس قسم کی باتیں دیکھی نہیں ۔ حالانکہ اگر یہ لوگ کبھی غور و فکر کی ہمت کرتے تو ہو سکتا تھا کہ خود اسلاف میں بھی اس قسم کی باتیں مل جاتیں۔ اس لئے کہ انہی میں سے جنھوں نے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا۔ انھیں ایسی باتیں مل ہی گئیں۔ اسی قسم کی ایک مثال ہم آج پیش کر رہے ہیں دنیائے مذہب میں شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں نہ ہی جناب عبید اللہ صاحب سندھی کا نام نامی۔ اوّل الذکر متقدمین میں اور ثانی الذکر متاخرین میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جناب سندھی حکمتِ ولی اللہی کے بہت بڑے مفکر اور مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے شاہ ولی اللہؒ کے متعلق ایک بسیط مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا جو رسالہ الفرقان کے "ولی اللہ نمبر" میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مقالہ قرآن۔ حدیث فقہ وغیرہ کے متعلق شاہ صاحبؒ کے اہم خیالات پر مشتمل ہے۔ ہم اس مقالہ سے جستہ جستہ مقامات نقل کرتے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ ان اصولی مباحث میں حضرت شاہ صاحبؒ اور جناب سندھی کا مسلک کیا ہے۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم ان حضرات کے خیالات کو بطور سند پیش نہیں کر رہے اسلاف اور اپنے ہم عصر حضرات، کی پوری تعظیم و تکریم کے جذبات کے ساتھ ساتھ ہم اس حقیقت کا بھی اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک دین کے معاملہ میں کسی انسان کی رائے یا عقیدہ حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جو رائے یا عقیدہ قرآن کریم کے مطابق ہوگا وہ قابل قبول ہوگا۔ ورنہ ہم کہدیں گے کہ ان حضرات نے غلط سمجھا۔ اسی اصول کا ہم اپنے اوپر بھی اطلاق کرتے ہیں۔ ہماری جو بات کتاب اللہ کے خلاف ہو اسے آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی درخور اعتنا تصور نہ فرمائیے۔

جناب سندھی نے محولہ صدر مقالہ مختلف صحبتوں میں املا فرمایا اور ایک دوسرے صاحب نے اسے قلمبند کیا تھا۔ بنا بریں مقالہ میں خاص طور پر ربط قائم نہیں رہ سکا۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اقتباسات میں ربط ملحوظ رکھا جائے۔ نیز بعض مقامات پر تھوڑی بہت تشریح کی بھی ضرورت محسوس کی گئی ہے جناب سندھی کے مقالہ کے اقتباسات واوین ("........") میں درج کئے گئے ہیں۔ واوین سے باہر کی عبارت ہماری اپنی ہے۔ آپ ان اقتباسات کو غور و تعمق سے مطالعہ فرمائیے اور استیعاب کے لئے اصل مقالہ کی طرف رجوع کیجئے۔ واللہ المستعان۔

۱۔ فقہ اور قرآن | جناب سندھی فرماتے ہیں :۔

"فقہائے عظام نے قرآن عظیم کو اپنی اصولِ فقہ میں پہلے درجہ پر رکھا ہے مگر اس سے مراد ان کے یہاں چند آیات احکام ہیں جو اوامر و نواہی کی شکل میں قرآن حکیم میں مدوّن ہیں۔ اس تخصیص کا یہ اثر پیدا ہوا کہ ایک عالم سارا قرآن سمجھنا ضروری نہیں جانتا۔ پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کی تفسیر واعظوں اور قصہ گو، افسانہ طراز لوگوں کے ہاتھ آگئی اور فقہاء کا اس میں دخل نہ رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جن لوگوں نے یہ خیال بنا یا تھا کہ فقیہ بننے کے لئے قرآن کریم کے فقط اوامر و نواہی کافی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ قرآن کو مس تک نہیں کر سکتے۔ جب مسلمانوں کی مرکزی جماعت کا قرآن عظیم کے متعلق یہ خیال ہو تو عوام بیچارے اس بارے میں کہاں تک قابلِ ملامت قرار دئے جا سکتے ہیں" (صـ۲۴۳ و صـ۲۴۶)

یہ ان فقہا کی کیفیت تھی جنھوں نے فقہ کی تدوین کی۔ بعد میں آنے والے حضرات نے قرآن کریم کی طرف اتنا سا رجوع بھی ضروری نہ سمجھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک دین، تمام و کمال۔ فقہ کے اندر آچکا تھا جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل جائز نہ تھا۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں اور سب کچھ پڑھایا جاتا ہے لیکن قرآن پڑھانے کی ضرورت بالکل نہیں سمجھی جاتی۔ قرآن کی تلاوت محض ثواب کی خاطر رہ گئی ہے۔

۲۔ شانِ نزول | جناب سندھی فرماتے ہیں :۔

"ائمہ فقہا نے اپنے اصول میں بالاتفاق یہ مسئلہ درج کیا ہے کہ اگر قرآن شریف میں ایک آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو اور مفسرین اس کا کوئی خاص واقعہ سبب بتاتے ہوں تو قرآن فہمی میں عموم الفاظ ہی مدنظر رہے گا۔ خصوصیتِ محل کو اس میں دخل نہیں ہوگا۔ اس قاعدے پر اتفاق کرتے ہوئے آپ جس تفسیر کو اٹھا کر دیکھیں گے ہر آیت کے ماتحت ایک جزئی واقعہ پائیں گے۔ مثلاً یہ آیت ابوجہل کے حق میں ہے۔ یہ عبداللہ بن ابی منافق کے بارہ میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق کی فضیلت میں اتری۔ اس میں اہلِ بیت کے فضائل کا بیان ہے؟ عام اساتذہ اور طلبہ کو آپ انہیں جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائیں گے۔ شاہ صاحبؒ نے "الفوز الکبیر" کی ابتداء میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا ہے اور آیات احکام کا مطلب یہ بتلایا کہ اجتماعی طور پر انسانوں میں جو بداخلاقیاں اور بداعمالیاں موجود ہیں ان کو ان آیات کا سبب نزول سمجھنا چاہیئے۔ عرب۔ یا عجم زمانے کے تقدم یا تاخر سے ان کا کوئی تعلق نہیں"۔ (صـ۲۴۳)

یہ اس لئے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی ایک ماحول۔ ایک زمان یا ایک مکان کے لئے نہیں بلکہ ہر

اصول، ہر زبان ۔ اور ہر مکان کے لئے ہے ۔ اور کسی شانِ نزول ۔ موقعِ نزول یا واقعہ نزول کا پابند نہیں ۔ وہ قیامت تک کے لئے دینی نصاب ہے اور ہر زمانہ میں اس سے نئی روشنی نکالی جاسکتی ہے ۔ اس لئے فہم قرآن کو کسی ایک زمانہ سے وابستہ کر دینا بھی درست نہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جناب پرویز کی معرکتہ الآرا کتاب "معارف القرآن" کا بصیرت افروز مقدمہ ۔ از علامہ اسلم جیراجپوری)

۳۔ عقل اور قرآن جناب سندھی فرماتے ہیں :۔

" عام مفسرین نے روح کے علم کو متشابہات میں داخل کر رکھا ہے ۔ کوئی مفکر اس کے قریب نہیں جا سکتا اس لئے تمام مسائل بعد الموت ۔ تحت اللفظ ترجمہ پڑھنے سے زیادہ قابل غور نہیں سمجھے جاتے ۔ یہاں تک کہ عقائد کی کتابوں میں توحید اور نبوّت کا مسئلہ تو عقلی مانا جاتا ہے اور عذاب القبر سے لیکر آگے کی تمام بحثیں نقلی سمجھی جاتی ہیں ۔ عذاب القبر کو صرف اس لئے مانا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر موجود ہے ۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی تالیفات میں مسلمانوں کو اس غلطی سے بچایا ہے ۔ ابعد الموت جو زندگی قرآن ثابت کرتا ہے ان کے یہاں مسلسل عقلی نتائج کا مجمل بیان ہے ۔ عقل صریح کی پوری تائید کے بغیر کوئی چیز قرآن منوانے کی خواہش نہیں رکھتا"
(ص ۲۴-۲۵)

ہم اس مقام پر روح کے مسئلہ میں الجھے بغیر اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم اپنے آپ کو نور کہتا ہے جو خود بھی روشن ہوتا ہے اور اپنے ارد گرد کی چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے ۔ وہ عقل کو مخاطب کرتا ہے اور اس کے دعاوی بصیرت پر مبنی ہیں اس لئے جہالت اور توہم پرستی کو اس میں کوئی دخل نہیں ۔ وہ سراپا حکمت ہے اور ہر صاحب بصیرت کو تفکر و تدبر کی بار بار دعوت دیتا ہے اس لئے جوں جوں انسانی علم و عقل ترقی کرتے جائیں گے ۔ قرآنی غوامض بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مقدمہ" جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے)

جناب سندھی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "عذاب القبر کو صرف اس لئے مانا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر موجود ہے" ۔ یہ بالکل درست ہے ۔ قرآن کریم میں عذاب قبر کا کہیں ذکر نہیں ۔ (اس کی تفصیل کے لئے علامہ اسلم جیراجپوری کی بصیرت افروز کتاب تعلیمات قرآن ملاحظہ فرمائیے ۔)

۴۔ متشابہات جناب سندھی ارشاد فرماتے ہیں :۔

"قرآن حکیم نے آیات قرآنی کی تقسیم محکمات اور متشابہات میں کر دی ہے۔ عموماً اہل علم متشابہات میں بحث کرنا ناممکن سمجھتے ہیں۔ پھر متشابہات کی ایسی واضح تعریف و تفسیر جس سے تمام ایسی آیتیں تحقیقی اور تحدیدی طور سے جدا کر لی جا سکیں۔ کوئی متفق علیہ موجود نہیں ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک تو قرآن تمام ناقابل فہم ہو گیا اور متشابہات میں غور نہ کرنا ایک اصول اور عقیدہ مقرر ہو گیا۔ ایک کتاب کی نسبت جب یہ عقیدہ بن جائے کہ اس کے بعض حصے (جس کا پورا تعین بھی نہیں) فہم سے بالاتر ہیں تو انسانی متوسط عقول کے لئے ساری کتاب مشتبہ بن جاتی ہے طبیعت میں خدشات اور اوہام اٹھتے ہیں کہ فلاں فلاں آیت کا جو مفہوم ہم نے معین کیا ممکن ہے کہ اس کی نقیض ان آیات میں موجود ہو جن کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس غلط فکر نے عمل کے لئے قرآن کی طرف سے مسلمانوں کے التفات کو یکسر ہٹا دیا۔۔۔۔۔۔۔۔ جو لوگ ان اصطلاحات کے پابند ہیں جن سے ان مسائل (تقدیر وغیرہ) پر غور کرنا کسی راسخ فی العلم کے لئے بھی جائز نہیں ہو سکتا (اور ان ہی سے مدارس و مکاتب بھرے پڑے ہیں) میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اس زمانہ میں اسلام کے لئے کس قدر مفید ہو سکتے ہیں" (صفحہ ۲۵ و صفحہ ۲۵۵)

صرف متشابہات ہی نہیں۔ بلکہ یہاں تو یہ حالت ہے کہ سارے قرآن کریم کے متعلق جو کچھ پچھلی تفاسیر میں آ چکا ہے۔ اس میں مزید تدبر و تفکر گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے۔

۵۔ ناسخ و منسوخ

جناب سندھی کا ارشاد ہے۔

"قرآن عظیم میں فکری انتشار کا ایک اور باعث مسئلہ ناسخ و منسوخ کی بحث بھی ہے۔ اہل علم منسوخ آیات کو متفقہ طور پر محدود و محصور نہیں کرتے۔ یعنی ایسی آیات کی تحدید میں وہ خود باہمی مختلف ہیں۔ اس کا اثر قرآن کریم پڑھنے والے پر یہ پڑتا ہے کہ وہ ہر عملی معاملہ (حکم) میں اس کے منسوخ ہونے کا شبہ پیدا کر کے اپنے آپ کو فارغ الذمہ بنا لیتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ شاہ صاحبؒ اس اصطلاح پر قرآن میں منسوخ نہیں مانتے۔ لیکن واضح رہے کہ شاہ صاحبؒ کا بیان اس فصل میں حکیمانہ ہے قوم کی عام حالت کو مدنظر رکھ کر انھوں نے اس مسئلہ کو تدریجاً سمجھانے کی سعی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پہلے اہل علم پانچسو آیتیں منسوخ مانتے رہے لیکن شیخ جلال الدین سیوطی اتقان میں بیس سے زیادہ آیتیں منسوخ تسلیم نہیں کرتے۔۔۔۔۔۔۔۔ شاہ صاحبؒ مذکورہ بالا بیس آیتوں میں بھی تطبیق دیکر نسخ کو پانچ آیتوں میں منحصر کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ جس شخص نے ان پندرہ آیتوں کی تطبیق غور سے پڑھی وہ باقی ماندہ پانچ آیتوں میں بھی بآسانی تطبیق

دے سکتا ہے۔ شاہ صاحبؒ صراحتہً یہ نہیں کہتے کہ قرآن شریف میں کوئی آیت منسوخ نہیں اور وہ اس طرح صراحتہً لکھنے تو بعض معتزلہ کے قول سے تشابہ ہو جاتا اور عام اہل علم اس پر غور کرنا ہی چھوڑ دیتے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مشکل آیتوں کو تو انھوں نے حل کر دیا اور نہایت آسان آیات میں نسخ مان لیا۔ اگر اسلوب حکیمانہ پر ان کے بیان کو حل کیا جائے تو ہمارا مذکورہ بالا نتیجہ اخذ کرنا بعید نہ ہوگا" (صفحہ ۲۵۵-۵۶)

قرآن کریم میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جس بناء پر صراحتہً ایسا نہیں لکھا۔ وہ دوسرے الفاظ میں وہی ہے جسے ہم نے شروع میں "لیبل" سے تعبیر کیا ہے (ناسخ و منسوخ کی بحث کے لئے معارف القرآن کا مجوّلہ صدر "مقدمہ" ملاحظہ فرمائیے)

۴۔ تفاسیر قرآن | جناب سندھی مختلف (مشہور و معروف) تفاسیر کے تذکرہ کے بعد فرماتے ہیں کہ

"ان سے ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق سوائے تحیر کے کچھ نصیب نہیں ہوا .... ہم مانتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں مسلمانوں نے انہی کتابوں سے قرآن سمجھا تھا جب وہ قرآن کی حکومت مجتہدانہ طور پر قائم کرتے تھے مگر اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ہمارے لئے ناممکن ہے" (صفحہ ۲۴۷) اس سے آگے حاشیہ میں مذکور ہے "دور حاضر کے طلباء اور علماء کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ کتاب الٰہی کی تعلیم کے وقت متن کو چھوڑ کر شرح (تفاسیر) پر زور دیتے ہیں۔ اور فن حدیث میں صحاح کی شرح حجۃ اللہ البالغہ سے پوری پوری غفلت برتنا کر صرف متون پر اکتفا کرنا شعار بنایا گیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں غیر طبعی ہیں" (صفحہ ۲۵۰)

قرآن کریم اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس کے لئے کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں۔ ہماری تفاسیر دراصل قرآن فہمی کی تاریخ ہیں۔ یعنی ان سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں فلاں دور میں قرآن کریم کس طرح سمجھا گیا۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن ہی سے ہو سکے گی۔ یہی وہ اصول ہے جس پر جناب پرویز نے اپنی کتاب معارف القرآن کو ترتیب دیا ہے جو قرآن کو قرآن ہی کے رنگ میں پیش کرتی ہے تفاسیر کے متعلق تفصیلی معلومات اس کتاب کے محققانہ مقدمہ سے مل سکیں گی۔

۷۔ مکمل کتاب | جناب سندھی رقمطراز ہیں۔

"اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے متن قرآن کی حقیقت اپنے اشراق سے اس طرح معین

کرلی کہ یہ کتاب بذاتِ خود ایک کامل مکمل نصاب ہے اس پر اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں" (صفحہ ۲۴۹)

یہ ہے وہ سب سے بڑا الزام جو ہمارے خلاف عائد کیا جاتا ہے یعنی ہم قرآن کریم کو مکمل کتاب کیوں مانتے ہیں اور اس میں کسی اضافہ کی ضرورت کیوں نہیں سمجھتے ہمارا دعوٰی یہ ہے کہ دین قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے۔ قرآن رسول اللہؐ کی وساطت سے اُمت کو ملا۔ یہ حضورؐ کا منصب رسالت تھا۔ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ زمین پر خدا کی حکومت قائم ہو یعنی قرآن کا قانون دنیا میں عملی طور پر نافذ ہو۔ امت تک قرآن پہنچانے کے ساتھ ساتھ حضورؐ پر حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا فریضہ بھی عائد ہوا۔ اور یہ ایک بالکل فطری شئی تھی۔ قرآن کاغذوں میں لکھے جانے اور زبان سے دہرائے جانے کے لئے نہیں نازل ہوا تھا بلکہ دنیا میں ایک نیا لیکن فطرتِ انسانی کے مطابق نظامِ زندگی قائم کرنے کے لئے نازل ہوا تھا۔ یہ نظامِ زندگی سب سے پہلے حضورؐ کے عہدِ سعادت مہد میں قائم ہوا۔ اور خلافت راشدہ تک جاری رہا اس میں قرآنِ کریم قانون اساسی تھا۔ کوئی چیز اس سے باہر نہ تھی اسی کی روشنی میں جزئی معاملات کے لئے فرعی قوانین مرتب ہوتے تھے اس کے بعد یہ سلسلہ گم ہو گیا اب (بتوفیق ایزدی) جس وقت پھر وہی نظام قائم ہوگا۔ اس میں قرآن قانون اساسی کی حیثیت رکھے گا اور دورِ اول کے فرعی قوانین۔ نئے نئے مباحث و معاملات کے تصفیہ کے لئے قوانین مرتب کرنے میں ممد و معاون ثابت ہونگے۔ یہ ہے دین کی عملی شکل۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اس باب میں جناب سندیہی کا کیا ارشاد ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

۸۔ قرآن و سنّت و اجماع

"تمام اہلِ علم قرآن شریف کے ساتھ سنت اور اجماع کو ادلّہ شرعیہ (یعنی دینی حجت۔ طلوعِ اسلام) میں شمار کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ سنت کو قرآن سے مستنبط چیز مانتے ہیں۔ لیکن اس استنباط کا طریقہ وہ نہیں ہے جو ائمہ فقہا میں مروج ہے۔ بلکہ حکمت کے اصول پر استنباط کرنے کے طریقے اور ان کے اصول شاہ صاحب کے یہاں علیحدہ مقرر ہیں خیر کثیر میں اس مسئلہ کی انھوں نے تفصیل لکھدی ہے اس طرح پر اگر سنت کو مانا جائے تو قرآن کے استقلال پر کوئی زد نہیں پڑے گی ص۱ رسول اللہ (صلعم) کے عہد سے خلافتِ راشدہ کے آخری وقت تک یعنی

ص۱ یعنی قرآنِ کریم میں حکم موجود ہو۔ اور رسول اللہ نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہو۔ اس طرح دین کا مستقل نصاب قرآن کریم ہی رہیگا۔ طلوعِ اسلام

شہادت حضرت عثمانؓ (۳۵ھ) تک شاہ صاحبؒ کی تحقیق میں، مسلمانوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ اس دور کو وہ دورِ اجماع کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل ازالتہ الخفا میں مذکور ہے شہادت حضرت عثمانؓ کے بعد اختلاف شروع ہوا۔ اب اجماع وہی مستند ہوگا جو مذکورہ دورِ اول کے تتبع میں[صد۲] منعقد ہو۔ شاہ صاحبؒ اس دور کو خیر القرون قرار دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل ازالتہ الخفا میں موجود ہے۔ اسے ساری دنیا جانتی ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا مستند سوائے قرآن عظیم کے کوئی لکھی ہوئی چیز نہ تھی۔ اس پر یہ جماعت اپنے پارٹی پالیٹکس کے نظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے عمل کرتی تھی۔ اس پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کی طرف اشارہ ہے قرآن حکیم کی ذیل کی آیت میں۔ السّابقونَ الاوّلونَ مِنَ المہاجِرینَ وَالانصار، وَالّذینَ اتّبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہُ۔ رسول اللہؐ کی صحبت اور تعلیم سے جو جماعت قرآن پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوئی۔ اس کا وہ مرکزی حصہ جس کا ہر قول و فعل خدائے تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ وہ مہاجرین اور انصار کا پہلا طبقہ تھا۔ اس کی اتباع قرآن پر عمل کرنے کے لئے قیامت تک مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ (یعنی قرآن کے اصولوں میں نہ کہ فرعی قوانین میں جس کے متعلق خود جناب سندھی نے اگلی سطروں میں فرمایا ہے کہ وہ ہر زمانہ میں قابلِ تغیر ہو سکتے ہیں۔ طلوع اسلام) جو چیز اس زمانہ میں متعین ہو گئی۔ اس کو اس شکل میں اور اسی معنی میں قائم رکھنا اتباع بالاحسان ہے۔ (اسی شکل سے مراد غالباً نماز۔ روزہ وغیرہ کی شکلیں ہیں جسے ہم عملِ متواتر یا تعامل سے تعبیر کرتے ہیں۔ ورنہ فرعی معاملات کی شکلیں تو ہر زمانہ میں بدلتی رہیں گی۔ طلوع اسلام) زمانے کے تغیرات سے جو نئی چیز قابلِ بحث پیش آئے وہاں اس جماعتِ متبعین بالاحسان کا فیصلہ ماننا ضروری ہوگا (یعنی حکومت الٰہیہ قائم کرنے والی جماعت کی سنٹرل کمیٹی۔ طلوع اسلام) یہ اس دور کے مابعد کے اجماع کا حاصل ہے۔ اس طرح اجماع قرآن کی حکومت قائم کرنے والی جماعت کے متفقہ فیصلے یا اغلبیت کے فیصلوں کا نام ہوگا۔ لہذا اجماع قرآن سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ اجماعیات، قرآنی اصول کے تشریحی بائیلاز ہوں گے۔ اس سے کوئی ترقی کن جماعت۔ جو زمانہ کے طویل عرصہ میں کام کرے۔ خالی نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اجماع بھی قرآن کے مقابل ایک مستقل اصل نہ بنا بلکہ قرآن کی حکومت قائم کرنے والی جماعت کے اتفاق کا نام ہوا۔ اس طور سے مسلمانوں میں قرآن کے

صد۲ یعنی حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہو اور اس میں مسلمانوں کی مرکزی جماعت متفقہ طور پر یا اکثریت سے کسی فیصلے پر پہنچے۔

(طلوع اسلام)

مستقل درجہ کا تعارف کرانے والی شخصیت امام ولی اللہ دہلوی ہیں" (صفحہ ۲۶۲)

اسی چیز کو جناب سندھی نے حاشیہ میں اور بھی واضح فرمایا ہے۔ اقتباس سے پیشتر (عام قارئین کے سمجھنے کے لئے) ایک بات تمہیداً الھدینا ضروری ہے۔ متشدد فی الحدیث طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جو کچھ بھی ارشاد فرمایا وہ وحی (یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ) ہے اس کا ایک حصہ قرآن ہے۔ اور دوسرا حصہ احادیث۔ اس کی سند میں وہ قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ الاوحیٌ یوحیٰ" (یعنی یہ رسول اپنی ذاتی خواہش سے کچھ نہیں کہتا بلکہ یہ تو وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے) حالانکہ اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ قرآن ایک وحی ہے جو حضور پر نازل کی گئی ہے۔ حضور اسے اپنی طرف سے وضع کرکے (معاذاللہ) پیش نہیں کر رہے۔ اس کے بعد جناب سندھی کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔ آپ لکھتے ہیں :۔

"علمائے اصولِ فقہ لکھتے ہیں کہ اصولِ دین چار ہیں۔ کتاب وسنت واجماع وقیاس۔ درحقیقت یہ تعبیر صحیح نہیں۔ کیونکہ قیاس تو وہی معتبر ہے جو اصول ثلاثہ سے مستنبط ہو۔ باقی رہے تین اصول۔ سو ہمیں بڑی محنت کے بعد معلوم ہوا کہ ساری سنت قرآن سے مستنبط ہے۔ خیر کثیر ص۸۷ میں اس کی تصریح موجود ہے (یعنی قرآن سے باہر سنت کہیں نہیں ہے۔ طلوع اسلام) پھر آنحضرت صلعم اور خلفاء ثلاثہ کے متفقہ فیصلہ کے بغیر کوئی عمل مستند نہیں ہے (یعنی اس دور میں اجماع انہی کے متفقہ فیصلوں کے نام تھا۔ طلوع اسلام) کیونکہ حضرت علیؓ کے عہد میں خیرالامم سے مشورہ کا جوہر کھو گیا تھا۔ لہٰذا اجماع کا مدار بھی کتاب وسنت پر ہوا۔ بناءعلیہ اصل ہے فقط کتاب اللہ۔ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، ای ماینطق بالقرآن عن الھویٰ ہمارا رسولؐ دین کے معاملہ میں کوئی ہوائی کی بات نہیں کہتا۔ ذاتی خواہش کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ اور دین قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے۔ یہاں ماینطق سے مطلق نطق (یعنی رسول اللہ کی ہر ایک بات طلوع اسلام) مراد رکھ کر وحی متلو اور غیر متلو کو ملا دیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں یہ پسندیدہ نہیں۔ بلکہ مطلق نطق بالقرآن (یعنی قرآن کی بات۔ طلوع اسلام) مراد ہے۔"

اوپر کی عبارت چونکہ زیادہ واضح نہیں اس لئے اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ جناب سندھی کے نزدیک (یعنی شاہ صاحبؒ کی تعلیم کے مطابق) قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں کے فیصلے (سنت) ناقابل تغیر ہیں اور انھیں اسی شکل میں قائم رکھنا اور اسی طرح ان کی اتباع کرنا ضروری ہے۔ ذیل کی تشریح میں جناب

سندھی نے اپنے مفہوم کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرما دیا ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلعم اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورہ سے تجویز کئے۔ خلافت عثمانیہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں .... سنت کو ہمارے فقہاء حنفیہ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے۔ اور یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے .... اصل قانون اساسی متعین ہے۔ بائیلاز اُس وقت اور تھے اِس وقت اور ہونگے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہونگی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا۔ اور اس کا نام فقہ ہے" (صفحہ ۲۶۲)

یعنی رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین نے حکومت الٰہیہ کے قیام میں باہمی مشاورت سے قرآن کریم کی روشنی میں جو تمہیدی قوانین (بائیلاز) مرتب فرمائے ان کا نام سنت ہے۔ یعنی اُس زمانہ کی فقہ۔ یہ بائیلاز ہر زمانہ میں بدلتے رہیں گے۔ لیکن اصل قانون (قرآن کریم) اپنی جگہ پر قانون اساسی کی حیثیت سے مستقل رہے گا۔

۹۔ قرآن اور حدیث

جناب سندھی کی مذکورہ صدر تصریحات کے بعد حدیث کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے لیکن مروجہ جمع و تالیف کی رو سے احادیث کے مجموعوں کی کیا حیثیت ہے! اس کے متعلق وہ مزید وضاحت فرماتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ

"سورۃ النجم کی آیت ان ھو الا وحی یوحیٰ کی دو طرح تفسیر کی جاتی ہے۔

(۱) شاہ صاحب کے طریقے پر تحقیق یہ ہے کہ ضمیر ھو قرآن کی طرف راجع ہے۔ اور وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ میں بھی نفسِ قرآنی کے متعلق بحث ہے۔

(۲) مگر اہل علم کی دوسری جماعت اس آیت کو قرآن سے مخصوص نہیں مانتی اور رسول اللہ صلعم کے تمام تر اقوال کو ایک طرح کی وحی ثابت کرنے پر زور دیتی ہے۔ ان کے نزدیک وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ

قرآنی نقل سے مقید نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلعم کا ہر قول وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى میں داخل ہے اور اسی کو إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى میں وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱) ان حضرات کے نزدیک حدیث کی اصل بھی وحی ہی سے ثابت ہے فقط الفاظ کا فرق ہے۔ قرآنی الفاظ وحی سے معین ہوئے اور حدیث کے الفاظ رسول اللہ صلعم کے اپنے طبعی ملکہ سے صادر ہوئے ہیں مگر معنی سب کے سب وحی ہیں۔

(۲) پھر ان کے نزدیک یہ فرق بھی موجود ہے کہ قرآن خود رسول اللہ صلعم کے سامنے ایک مصحف میں کتابتہ محفوظ کر دیا گیا اور اس کی روایت بالتواتر قائم رہی لیکن حدیث میں جو وحی آئی ان کے نزدیک بھی نہ تو حضورؐ کے زمانہ میں اس کی کتابت ہوئی اور نہ اس کے لئے تواتر ضروری ہے۔

ان لوگوںؒ کی اصطلاح پر اگر کتب مقدسہ سابقہ کو کتب حدیث کا درجہ دیا جائے تو بطریق اولےٰ اس کو مستبعد نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر یہ لوگ اس بات کو تسلیم کرلیں تو تمام اشکال حل ہو جائیں۔ (۱) ہماری کتب حدیث میں بالاتفاق غیر صحیح روایات بھی موجود ہیں۔ (۲) نیز ان کتب حادیث میں ایک واقعہ کو مختلف طریقوں سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ (۳) ہماری بہت سی کتب حدیث میں کاتبوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جن کو محققین علماء درست کرتے رہتے ہیں۔ اسکے بعد اگر اناجیل اربعہ کو ہماری صحاح اربعہ (صحیحین۔ ابوداؤد۔ ترمذی) کے درجہ پر رکھ دیا جائے تو ذرہ برابر اختلاف نظر نہیں آئے گا۔" (صفحہ ۲۶۶-۲۶۷)

یعنی وحی تمام کی تمام قرآن کریم کے اندر محصور ہو چکی ہے اسکے باہر کہیں نہیں پھر جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے آپؑ کی سیرت لکھی جس میں آپؑ کے اقوال و اعمال کو اپنی انفرادی کوشش سے جمع کیا اسی طرح مسلمان ائمہ تاریخ و روایات نے نبی اکرمؐ کی سیرت اور حضورؐ کے عہد مبارک کی تاریخ مدون کی تاریخ و سیرت کی ان کتابوں کا نام جو اس طرح کی روایات پر مشتمل ہیں۔ کتب احادیث ہیں۔ نہ یہ وحی ہیں۔ نہ وحی (قرآن) کی طرح محفوظ اور اس لئے یقینی نہیں ہیں جس طرح کتب اناجیل یقینی نہیں ہیں۔ (ان امور کی تفصیل کے لئے علامہ اسلم جیراجپوری کا مضمون "علم حدیث" اور جناب پرویز کا مضمون "شخصیت پرستی" ملاحظہ فرمائیے)۔

جناب سندھی کے مضمون کے حاشیہ میں خود شاہ صاحبؒ کی عبارت درج ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

(عبارت فارسی میں ہے)

"کتاب الٰہی کے لئے دو چیزیں لازم ہیں۔ اول ملکوت کی برکتیں اور ملاء اعلیٰ کی خوشنودگی اور پسندیدگی

ہر اس شخص کے لئے جو کتاب کی تلاوت کرے اور اس کی اشاعت میں کوشش کرے۔ دوسرے طویل زمانوں کے گذر جانے پر بھی اس کتاب کا باقی رہنا اور امت کے لئے اس کے حفظ کرنے کی توفیق حاصل ہونا۔ اگر یہ دو باتیں نہ پائی جائیں تو وہ کتاب کتاب الٰہی نہ ہوگی بلکہ انسانوں میں سے کسی فرد کی تالیف ہوگی جس نے اپنے ارادہ سے علم پیغمبر کو جمع کیا۔ جیسے ہمارے دین میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں" (ص ۲۶۵)

جناب سندھی کے الفاظ میں "اس طرح انبیاء کی سیرتوں کو جمع کرنا پہلے زمانہ میں بھی رائج رہا ہے" (ص ۲۶۵)

لہذا کتب احادیث درحقیقت کتب تاریخ ہیں۔ اور کتب تاریخ میں ہر طرح کی روایات درج ہوتی ہیں۔

صحاح ستہ میں غلط روایات کا اختلاط

چنانچہ جناب سندھی فرماتے ہیں۔

"میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کے مقدمہ مشکوٰۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں اور شیخ صاحب نے ان سب کو ایک درجہ پر رکھا ہے۔ وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں۔ جس طرح باقی کتب میں تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہوگئی" (ص ۲۶۹)

آگے چل کر جناب سندھی نے فرمایا ہے کہ یہ پریشانی حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ کے بعد رفع ہوئی۔

ضعیف روایات متواتر کیسے بن جاتی ہیں

جناب سندھی مختلف طبقات کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ان کے سوا بعض ایسے محدثوں نے بھی کتابیں تصنیف کیں جن کی لیاقت علمی بھی مسلم نہیں ہے۔ متاخرین محدثین نے .... ان غیر معتبر کتابوں کی روائتیں زوائد کے نام سے جمع کر دیں جس سے علم حدیث میں فتنے کا دروازہ کھل گیا۔ اس ذخیرہ میں کافی سے زیادہ روائتیں ایسی موجود ہیں جن کو دوسرے طبقہ کا مصنف ضعیف قرار دیتا ہے اور ان طبقات العینی تیسرے چوتھے اور پانچویں میں پہنچکر ان متاخرین کے نزدیک وہ حدیث متواتر بن جاتی ہے" اس کے بعد آپنے ایک حدیث کی مثال دے کر لکھا ہے "ترمذی نے اس حدیث کی تضعیف کر دی۔ اب مستدرک حاکم کو دیکھئے۔ وہ اس جملہ مضاعفہ کو تیں چالیس سندوں سے روایت کرتا ہے۔ ایک غیر محقق عالم اس کثرتِ اسانید سے متاثر ہو کر اس کی صحت یا اس کے درجۂ شہرت اور تواتر پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ہم نے حاکم کی ان روایات کی تنقید فتح الباری کی امداد سے شروع کی تو ان میں سے ایک اسناد بھی صحیح نہ نکلی"

(ص ۲۷۵)

صحیح بخاری کی ضعیف روایات

اس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں۔
"تھوڑی تھوڑی غلطیاں ہر مصنف سے ہوتی رہیں چنانچہ امام بخاری جو سب سے زیادہ متقن مانے جاتے ہیں ان کی کتاب میں حافظ ابن حجر چالیس کے قریب ایسی احادیث مانتے ہیں جن کی اسانید ضعیف ہیں اور حافظ صاحب کے پاس بھی ان کا کوئی حل نہیں"۔ (صفحہ ۲۷) حاشیہ میں ہے "یوں تو حافظ ابن حجر نے صحیح بخاری میں سو کے قریب معلل روائتیں نکالی ہیں۔ پھر ان خدشات کے جوابات بھی بیان کئے ہیں۔ مگر چالیس کے قریب روایات کا ضعف ان کے نزدیک اس درجہ کا ہے کہ بہ اعتراف حافظ اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا"۔

صحیح اور ضعیف احادیث کا معیار

متشدد فی الحدیث طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ موجودہ مجموعہ احادیث میں حدیثوں کی جو تقسیم ہوچکی ہے وہ اٹل ہے۔ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جاسکتی۔ جسے صحیح قرار دیا جاچکا ہے وہ صحیح۔ جسے ضعیف کہہ دیا گیا ہے وہ ضعیف۔ یعنی اسے تقلیداً ماننا پڑیگا قرآن کریم کی روشنی میں اپنی سمجھ سے آپ کچھ نہیں کرسکتے۔ جناب سندھی فرماتے ہیں۔

"یہ خرابی جو عام اذہان پر مستولی ہے اس کی تہ میں یہ مرض پنہاں ہے کہ حدیث کے فن کو خصوصاً تصحیح اور تضعیف کو تقلیداً اخذ کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا عالم جو اپنی سمجھ سے صحیح حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہو آج پیدا ہونا متعذر ہوگیا ہے[1]۔ اسماء الرجال میں توثیق و تضعیف کا اختلاف پھر صحیح حدیث کی تعریف میں مختلف آراء۔ طالب العلم میں یکسوئی سے کوئی ملکہ پیدا ہونے نہیں دیتیں۔ آخر مجبور ہو کر۔ فقہا کا جو متوارث مسلک ہے اسی میں راجح و مرجوح کی تمیز پیدا کرنے کے بعد جو حدیث اس مسلک کے موافق ہو اسے صحیح اور جو مخالف ہو اس کو ضعیف بنانے کی استعداد حاصل ہونے پہ طالب العلم اپنا سفر ختم کردیتا ہے"۔ (صفحہ ۲۷۵) اور اس کے بعد دین کا واحد ٹھیکہ دار بن جاتا ہے جسے چاہے مسلمان سمجھے۔ جسے چاہے کافر قرار دیدے۔

صحیح بخاری کی بعض احادیث

جیسا کہ طلوع اسلام کے صفحات پر کئی مرتبہ آچکا ہے۔ ہماری کتب احادیث میں ایسی ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کرتے ہوئے دل کانپ اٹھتا ہے۔ ان مقامات کی تصریح سے ہم مجتنب رہے ہیں اس لئے کہ ان کا ذکر کرنا بھی بڑا مشکل ہے۔ دیکھئے! جناب سندھی اس باب میں کیا فرماتے ہیں:۔

---

[1] جو اس کا دعوے کرتے ہیں ان پر کفر کے فتوے عائد کردئے جاتے ہیں۔

"جس قدر میری توجہ قرآن کی طرف بڑھتی گئی اور نوجوانوں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا اسی قدر میرے سابقہ یقین میں تزلزل پیدا ہونے لگا۔ میں اس کا کبھی قائل نہیں ہوا کہ دینی تعلیم اگر عربی مدارس کے طلباء کو دیجائے تو اطمینان بخش ہو اور اگر وہی تعلیم کالج کے طلباء کو دیجائے تو اطمینان پیدا نہ کرسکے۔ اگر ایسا ہو تو وہ تعلیم حقیقی اسلام کی تعلیم نہیں ہوگی اس لئے کہ قرآن ساری دنیا کے لئے نازل ہوا ہے۔ اگر کالج کے طلبہ کو ہم قرآن کی تعلیم اسی طریقے پر (جو عربی مدارس میں کامیاب ثابت ہوا نہیں دے سکتے تو غیر مسلم لوگوں کو ہم کیا پڑھا سکتے ہیں۔ ...... رہا یہ کہ بخاری میں میرے اشکالات کیا ہیں اور میں ایک یورپین نو مسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ ان تفاصیل پر میں مجالس عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں۔ اہلِ علم جو تکمیل کر چکے ہیں۔ یا تکمیل کے قریب ہیں۔ ان سے میں مذاکرات میں سب کچھ کہدوں گا۔" (صفحہ ۲۸۵-۲۸۶)

علامہ حمید الدین فراہیؒ مرحوم اور حدیث

ہمارے زمانہ میں علامہ حمید الدین فراہیؒ ایک ایسے بزرگ عالم گذرے ہیں جنھیں قرآن کریم سے عشق تھا۔ ان کی تفاسیر کے مختلف ٹکڑے جو دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ کی سعی و کاوش سے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ قرآن سے ذوق رکھنے والوں کے لئے بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ جناب سندھی نے اس مقام پر جناب فراہیؒ کا ایک واقعہ بھی نقل فرمایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"مولانا حمید الدین مرحوم میرے بہت پرانے دوست تھے۔ قرآن شریف کے تناسق آیات میں ہمارا مذاق متحد تھا۔ ...... جب تک ہندوستان میں ان سے ملتا رہا۔ حدیث شریف کے ماننے نہ ماننے کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوا۔ اتفاقاً جس سال میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں۔ اسی سال وہ بھی حج کے لئے آئے۔ ہماری باہمی مفصل ملاقاتیں رہیں۔ افکار میں بے حد توافق پیدا ہوگیا تھا مگر وہاں بھی حدیث کے ماننے نہ ماننے پر بحث شروع ہوگئی۔ ہم نے سختی سے ان پر انکار کیا اور کہا کہ حدیث کو ضرور ہی ماننا پڑے گا۔ تنگ آکر فرمانے لگے۔ آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں میں نے کہا موطا مالک۔ فرمایا ہم اس کو مانتے ہیں۔ میں نے کہا بس آج سے ہمارا نزاع ختم ہے۔ ہم آپ کو صحیح بخاری ماننے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔" (صفحہ ۲۸۷)

جناب حمید الدین فراہیؒ کی کتاب نظام القرآن شائع ہو چکی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب سے حدیث کے متعلق چند اقتباسات پیش کردئے جائیں تاکہ ان کا مسلک بھی سامنے آجائے۔ ان اقتباسات کے لئے ہم رسالہ البیان کے لئے شکر گذار ہیں۔ جناب فراہیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے ...... حدیث۔ اجماع اور صحفِ اولیٰ یہ تینوں ظن و شبہ سے خالی نہیں ..... میں نے بعض روائتیں دیکھی ہیں جو آیتوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہیں۔ اور ان کے نظام کو پارہ پارہ کردیتی ہیں ...... ان لوگوں پر تعجب ہے جو آیت کی تاویل تو کر لیتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کا سا نہیں رکھتے ...... تعجب پر تعجب ہے ان لوگوں پر جو ایسی روایتیں تسلیم کر لیتے ہیں جو نص قرآن پر بھی ہاتھ صاف کر دیتی ہیں۔ مثلاً کذب ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرم کا نطق قرآن بغیر وحی کے ایسی روایتوں کے تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں جو اگرچہ اصول روایت پر پوری نہ اتریں۔ لیکن درایت کی کسوٹی پر کھری ثابت ہوں ...... حدیث اور تواتر قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتے ..... ہم اس عقیدہ سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں کہ رسول خدا کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے۔ ایسا خیال یقیناً راویوں کا وہم و خطا ہے .... میں کہہ چکا ہوں کہ اختلاف احادیث میں قرآن حاکم ہے۔ یہاں اس قول کی وضاحت کیجاتی ہے میں بعض لوگوں کے طعن سے ڈرا کرتا تھا۔ لیکن حدیث کے متعلق ان کا مبالغہ یہاں تک پہنچ گیا کہ انھوں نے حدیث کو اس آیت کے تحت داخل کر لیا (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون) یعنی حدیث کو بھی اللہ نے نازل فرمایا ہے اور وہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے قول کے نتائج پر غور نہیں کیا۔ پس وقت آگیا کہ میں سچائی کا علم بلند کر دوں اور قطعاً پرواہ نہ کروں۔ چاہے میرا سر کاٹ ڈالا جائے اور میرا بند بند الگ کر دیا جائے ...... اکثر اہل حدیث کے دلوں میں یہ بات سمائی ہے کہ بخاری اور مسلم نے جو کچھ روایت کر دیا۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں پس ہم بعض قابل اعتراض مقامات لکھتے ہیں تاکہ تم سمجھ سکو کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو رب ٹھہرانے کی شناعت فرمائی ہے۔ پس ہم ان کے غیر معقول نکرد فہم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں .... پس ان متضاد روایات میں اطمینان کی کوئی صورت نہیں۔ ان سے اور زیادہ قلق و تشنگی کے سوا کوئی امید نہ رکھو طریق واضح اتباع لغت[1] اور تدبر فی القرآن ہے۔ اور بس"

قرآن اور فقہ کی کتاب

جناب سندھی فرماتے ہیں:-
"قرآن عظیم ہماری دانست میں اپنے موضوع کی مستقل کتاب ہے۔ گذشتہ

---

[1] لغت کو بھی قرآن کے تابع ہونا چاہیئے؛

فصول میں ہم نے اس کی توضیح کرنے کی سعی کی ہے۔ مگر آیاتِ احکام پر عمل کرنے کے لیئے ہمیں دورِ نبوت اور خلافت راشدہ کا طرزِ عمل معلوم ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے ہمیں ایک فقہ کی کتاب درکار ہے جس میں تصریح ہو کہ رسول اللہ صلعم یوں نماز ادا کرتے تھے مسلمانوں سے زکوٰۃ اس طرح وصول کرتے تھے۔ بیع و شریٰ کے معاملات اس طرح طے ہوتے تھے غرض جمیع آیاتِ احکام کی تفصیل رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے وفاقی دور (یعنی شہادت عثمانؓ تک) سے معلوم ہونی چاہیئے۔ اور یہ چیز موطا میں ملتی ہے .... امام ولی اللہ قرآن عظیم کے معانی کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں تقسیم کر چکے ہیں اور ان کے نزدیک ہر ایک باب ان میں سے اپنے افادے میں مستقل ہے۔ نہ تو کسی پہلی کتاب کا محتاج ہے اور نہ کسی بعد کے علم و عمل سے متاثر ہوتا ہے۔ البتہ فنِ احکام عملی طور پر آنحضرت صلعم کا اسوہ سمجھنے کا محتاج ہے۔ خیر القرون میں جس طرح قرآن شریف پر عمل کیا گیا وہ اہلِ مدینہ کے یہاں محفوظ تھا اور موطا اس کا ایک نصاب ہے اس لئے قرآن پڑھنے کے بعد موطا کی ضرورت بہرحال باقی رہے گی۔ شاہ صاحب کی تقسیم میں احکام کے سوا جو فنون ہیں ان میں قرآن حکیم کسی فن (مثلاً مغازی و تذکیر اور فتن و ملاحم) کا محتاج نہیں ہے۔ اب ایک ایسے امام کے لئے جو اسلام کو قرآن شریف میں مکمل پاتا ہو موطا جیسی فقہ کی کتاب کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔" (صفحات ۲۰۲)

یعنی قرآن کریم کے بعد ضرورت صرف اس قدر باقی رہ جاتی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ جن احکام کا ذکر قرآن میں موجود ہے ان پر رسول اللہ صلعم نے عمل کس طرح سے کیا۔ مثلاً قرآن کریم میں اقامت صلوٰۃ (نماز) کا حکم موجود ہے۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ حضور نے اس حکم پر عمل کس طرح کیا۔ چونکہ احکام پر عمل محسوس شکل میں ہوتا ہے اور وہ محسوس شکلیں امت میں متواتر نسلاً بعد نسلٍ چلی آ رہی ہیں اس لئے عملِ متواتر قرآن کے احکام کی تفصیل ہے۔ اور ضروری۔ موطا امام مالکؒ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں پانچ چھ سو سے زیادہ احادیث نہیں اور ان کا بھی بیشتر حصہ احکامات پر مشتمل ہے۔ اس لئے کتب احادیث میں فی الجملہ زیادہ صحیح ہے۔ قرآنی احکام کی عملی تفصیل کے لئے اگر اس کی طرف رجوع کر لیا جائے تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ لیکن یاں ہمہ یہ بھی جیسا کہ جناب سندھی نے فرمایا ہے۔ فقہ (بائیلاز) کی کتاب ہوگی۔ ان بائیلاز میں سے جو ایسے ہیں جن پر زمانہ کا تغیر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اسی شکل میں قائم رکھے جائیں گے (جیسے نماز روزہ وغیرہ) لیکن جو مقتضیاتِ زمانہ سے متاثر ہو جاتے ہیں ان کی جگہ ہر زمانہ میں دوسرے بائیلاز مرتب کئے جائیں گے۔ اسی لئے کہ جناب سندھی کے الفاظ ہیں۔

"جب اساسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ غرض یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی جماعت کے مشورہ سے تجویز کئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اصل قانون اساسی متعین ہوتا ہے۔ بائیلاز اس وقت اور تھے اس وقت اور ہوں گے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اس کا نام فقہ ہے" (۲۶۴)۔

مرکزیت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بائیلاز میں تبدیلیاں پیدا کرنے کا حق کسے حاصل ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس کا حق حکومت الٰہیہ کی مرکزی جماعت کو ہوگا۔ جناب سندھی فرماتے ہیں۔

"اس کے بعد میرے دماغ پر یہ اثر پیدا ہوا کہ قرآن عظیم دنیا کی تمام اقوام میں انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر قرآن عظیم کی تعلیم کو انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام مان لیا جائے تو اس کے لئے تین چیزوں کی تعیین ضروری ہے (الف) اس کا آئیڈیا (ب) اس کا پروگرام (ج) اس پروگرام کو چلانے والی سنٹرل کمیٹی۔ کوئی انقلابی تحریک پارٹی پالٹیکس کے سوا کامیاب نہیں ہوتی۔ اور ہر پارٹی پالٹیکس میں ان تین چیزوں کی تعیین ضروری ہے۔

(۱) میں نے قرآن عظیم میں غور کرکے اس کا آئیڈیا اس آیت کو مقرر کیا هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ [۱]

(۲) پروگرام کے لئے پہلے حزب اللہ کی تعیین و تحدید ضروری ہے۔ حزب اللہ اس پارٹی کا نام ہے جو قرآن عظیم کے انٹرنیشنل پروگرام کو کامیاب بنانا اپنا مقصد حیات قرار دیتی ہے۔ حزب اللہ کی ضروریات پر قرآن عظیم کی مختلف صورتوں میں کافی ہدایتیں دی گئی ہیں جہاں جہاں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وغیرہ سے مومنین کو خطاب کیا گیا کہ وہ کفار اور منافقین کے راستے پر نہ چلیں بلکہ فلاں فلاں حکم کی اس اس طرح پابندی کریں۔ ان تمام مواقع کو حزب اللہ کا پروگرام سمجھنا چاہیئے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے پہلے مخاطب حزب اللہ کے افراد ہی ہوتے ہیں

---

[۱] اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حقہ کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ دین تمام ادیان (نظام ہائے حیات) پر غالب آجائے۔ خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔"

اس میں مرد و عورت، عرب و عجم سب شامل ہیں۔ اس کا پہلا نمونہ السابقون الاولون من المہاجرین والانصار اور ان کے بعد (وَالَّذِیْنَ اتبعوھم باحسان) قیامت تک کی جمیع اقوام مسلمہ کو شامل ہے۔ اس طرح یہ پروگرام قیامت تک جاری رہے گا۔" (صفحہ ۲۹۴)

تصریحات بالا پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ طلوع اسلام گذشتہ چار برس سے کس مسلک کی طرف دعوت دیتا چلا آرہا ہے؟ جو کچھ گذشتہ اوراق میں درج کیا گیا ہے اس کا ملخص یہی ہے کہ۔

(۱) قرآن کریم مکمل کتاب ہے اور اپنی تفسیر میں کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں (۲) دین قرآن کریم کے اندر محصور ہے۔ (۳) احکام قرآنی (مثل نماز۔ روزہ وغیرہ) کی عملی تشکیل نبی اکرمؐ نے متعین فرمائی جس کی پابندی امت کے لئے لازمی ہے۔ یہ عمل محسوس متواتر ہم تک پہنچا ہے۔ (۴) نبی اکرمؐ کا ایک فریضہ تبلیغ رسالت (یعنی انسانوں تک قرآن کا پہنچانا) تھا اور دوسرا فریضہ حکومت الٰہیہ کا قیام (۵) حکومت الٰہیہ میں معاملات کے فیصلے قرآن کے قانون اساسی کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ قانونِ اساسی متعین اور غیر متبدل ہے۔ لیکن اسکی روشنی میں مرتب شدہ فروعی قوانین (بائیلاز) زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ (۶) فروعی قوانین کی ترتیب و تدوین حکومت الٰہیہ کے اربابِ حل و عقد کی مرکزی جماعت کا فریضہ ہے جسے قیامت تک جاری رہنا چاہئے تھا۔

(۷) خلافت راشدہ کے بعد یہ نظام برہم ہو گیا اور دین میں انفرادیت اور ملوکیت آگئی۔ (۸) اب پھر دین کو اپنی اصلی شکل میں قائم کرنے کے لئے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی ضرورت ہے جس میں قانون اساسی قرآن کریم ہوگا۔ اور تمہیدی قوانین (بائیلاز) قرآن کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق مرتب کئے جائیں گے اس میں قرنِ اولیٰ کی فقہ (بائیلاز) سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے اس طرح امت کے تمام اختلافات مٹ جائیں گے۔

(۹) کتب احادیث تاریخ کی ان کتابوں کا نام ہے جن میں عہد نبویؐ اور عہد صحابہؓ کے احوال و کوائف درج ہیں۔ یہ انسانوں کی انفرادی کوشش کا نتیجہ ہے اس لئے ظن و تخمین اور شک و شبہ سے بلند نہیں ہے نہ ہی تنقید سے بالا۔ جس طرح کتب اناجیل وغیرہ۔ احادیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کا معیار قرآن کریم ہے۔ جو احادیث اس معیار پر پوری اتریں۔ ان سے ہم اپنے زمانہ کے بائیلاز مرتب کرنے میں مدد لے سکتے ہیں۔ (۱۰) نبی اکرمؐ کا منصب رسالت پیغمبری حضورؐ کی ذات گرامی تک ختم ہو گیا۔ اب کوئی نبی اور رسول نہیں آسکتا۔ لیکن منصب امامت (حکومت الٰہیہ کا قیام و بقا) خلافتِ راشدہ[ص۱] میں منتقل ہو گیا اگر وہ نظام قائم رہتا تو یہ منصب آج تک جاری رہتا۔ اس منصب کے احیاء میں ہی اصل دین کے احیاء کا راز مضمر ہے۔

ص۱ اس کی تفصیل کے لئے علامہ اسلم جیراجپوری کا مضمون "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" مندرجہ طلوع اسلام بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء ملاحظہ فرمائیے۔

نقد و نظر

ایران بعہد ساسانیاں

ڈاکٹر آرتھر کرسٹن سین کی تصنیف بزبان فرانسیسی کا اردو ترجمہ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ مترجم ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور۔ ۸۰۶ صفحات۔ قیمت مجلد عہ۔ غیر مجلد عـ

مصنف ۱۹۱۹ء سے جامعہ کوپن ہاگن (ڈنمارک) میں السنہ ایرانی کے پروفیسر ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقعہ پر وہ ڈنمارک کی طرف سے نمائندہ بن کر ایران گئے تھے۔

"کتاب ساسانی خاندان کے تمدن کی تاریخ ہے۔ اس خاندان کی بنا اردشیر اوّل نے ۲۲۶ء میں ڈالی اور ۶۶۱ء میں عربوں کی تلوار نے اس کا خاتمہ کیا۔" اس خاندان کی سب سے بڑی اہمیت دنیا کی تاریخ میں یہ ہے کہ انہوں نے مسلسل چار سو سال تک رومیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکے رکھا، ورنہ سارا مغربی ایشیا، اور شاید ہندوستان بھی اب سے سترہ سو برس پہلے یورپ کا محکوم ہو چکا ہوتا۔"

اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے یہ کہ "خاندانِ ساسانی کے وارث و جانشین عرب بنے، ساسانیوں کے تمدن نے عربوں پر بہت گہرا اثر ڈالا..... عباسیوں نے تو سر سے پاؤں تک ساسانی شعار اختیار کر لیا۔ وہی آئینِ دربار، وہی عہدے، وہی طرزِ حکومت، وہی رسم و رواج، وہی روایات حتیٰ کہ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ساسانی خاندان دوبارہ زندہ ہو کر عباسی خاندان کہلایا۔" پھر یہی روایات دارالخلافت بغداد سے نکل کر تمام عالمِ اسلامی میں سرایت کر گئیں اور "یہ کہنا غلط نہیں کہ اکبر اور شاہجہاں کا دربار، نوشیرواں اور خسرو پرویز کا دربار تھا۔"

اس کتاب میں واضح کیا گیا ہے کہ زرتشت کے اصلی مذہب پر کن کن افکار و عقائد کا اثر پڑا۔ مثلاً مانیت ایشیائے کوچک کے پراسرار مذاہب، یہودیوں کے قبالائی اور باطنی عقائد، عرفانیت، مزدکیت، فلسفۂ یونان، وغیرہ، ان سب اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ

"وہ ابتدائی خوش بینی جو محنت اور کام کی محرک تھی اور جس پر مذہبِ زرتشت کی بنیاد تھی، جدید خیالات کے

نیچے دب گئے، زہد اور ترکِ دنیا کی طرف میلان .... رفتہ رفتہ زرتشتیوں کے تصور میں بھی داخل ہو گیا اور اُن کے مذہب کی بنیاد کو کھوکھلا کرتا گیا"

ان کے علاوہ ساسانیوں کے عقائد و افکار پر نہ صرف آریاؤں کے قدیم مذہب کا اثر تھا بلکہ ہندوستان کے عقائد بھی اثر انداز ہوتے رہے۔ چنانچہ قابل مصنف لکھتا ہے کہ

"زہد و رہبانیت زرتشتی اصول کے بالکل خلاف ہے لیکن عیسائیوں، عرفانیوں، مانیوں، اور مزدکیوں نے ترکِ دنیا اور زہد کی ایسی رٹ لگائی کہ بالآخر اس کے اثرات متعدی ہو کر مزدائیوں میں بھی پھیل گئے ان اثرات پر ہندوستانی عقیدوں کا اور اضافہ ہوا جن کا برزویہ (خسرو اوّل کے شاہی طبیبوں کا رئیس) سب سے بڑا نمائندہ تھا"

تقدیر کا غلط مفہوم کہ جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن برق قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ اس کی داغ بیل اسلام سے سو سال پیشتر خسرو اوّل کے عہد میں ڈالی جا چکی تھی"

"زروانی عقائد جو ساسانیوں کے عہد میں مروج تھے اس زمانے میں جبر کا عقیدہ پیدا کرنے میں ممد ہوئے جو قدیم مزدائیت کی روح کے لئے سم قاتل تھا۔ خدائے قدیم زروان جو **اہورمزد** اور **اہرمن** کا باپ تھا نہ صرف زمانِ نامحدود کا نام تھا بلکہ "تقدیر" بھی وہی تھا۔ کتاب **داوستان مینوگ خرد** میں .... "عقلِ آسمانی" (یا روح عقل) حسب ذیل اعلان کرتی ہے

انسان خواہ کتنا ہی طاقتور ذہین اور ذی علم کیوں نہ ہو تقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ تقدیر جب نیکی یا بدی کرنے پر آتی ہے تو عاقل کام کرنے سے عاجز رہ جاتا ہے اور بد منش میں کام کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے بزدل دلیر اور دلیر بزدل ہو جاتا ہے، کاہل محنتی اور محنتی کاہل ہو جاتا ہے"

باوجودیکہ دین زرتشتی حکومت کا مذہب تھا۔ یہ ملکی سیاست سے بالکل الگ تھا اور مذہبی پیشواؤں کے فرائض جو ایک خاص قبیلہ مُغان سے منتخب کئے جاتے تھے مندرجہ ذیل تھے۔

"مراسم تطہیر کا ادا کرنا، گناہوں کے اعترافات کا سننا اور ان کو معاف کرنا، کفاروں کا تجویز کرنا ولادت کی مقررہ رسوم کا انجام دلانا، رشتۂ مقدس یعنی زنار (کستیگ) کا باندھنا، شادی اور جنازہ

اور مختلف مذہبی تہواروں کے مراسم کی نگرانی ۔ ۔ ۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ سونے اور جاگنے اور نہانے اور زنار باندھنے اور کھانے اور چھینکنے اور بال یا ناخن ترشوانے اور قضائے حاجت اور چراغ جلانے کے وقت خاص خاص دعائیں پڑھیں ۔ ۔ ۔ ۔ جو شخص میت یا زچہ کو چھو جائے اس کی ناپاکی کو دور کرنے کے لئے جو رسم و قواعد تھے ان کا پورا کرنا ''۔ ۔ ۔

یہ وہ مباحث ہیں جو مسلمانوں کے افکار و عقاید کی تاریخ کے طالب علم کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوں گے ۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ افکار و عقاید کے بیشتر حصہ کا سرچشمہ کیا ہے ۔ یہ وہ مجوسیت تھی جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ :-

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد | محبت میں یکتا حمیت میں فرد!
عجم کے خیالات میں کھو گیا! | یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے! | مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

کتاب زیادہ تر عہد ساسانی میں ایرانیوں کے تمدن پر مشتمل ہے، اور یہی چیز ہے جس کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ جنگوں کے واقعات بہت کم لکھے ہیں ۔ مجموعی حیثیت سے کتاب دلچسپ اور پر از معلومات ہے ۔ قابل مصنف نے بہت محنت سے لکھی ہے ۔ ترجمہ بھی عمدہ ہے ۔

مترجم نے شجرۂ نسب خاندان ساسانی اور متعدد مقامات پر مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے فحش مقامات حذف کر دئیے ہیں تاکہ کتاب طالب علموں کے لئے بھی قابل مطالعہ اور مفید ہو سکے ۔ اردو زبان میں اس موضوع پر شاید ہی کوئی کتاب موجود ہو ۔ انگریزی میں بھی صرف رالنسن کی ''تاریخ ساسانیاں'' ہے لیکن ''اس میں صرف لڑائیوں کے حالات ہیں ''۔ اس کتاب کی اشاعت میں، انجمن ترقی اردو نے بھی بڑی ہمت سے کام لیا ہے ورنہ ''اہل ذوق جانتے ہیں کہ اس قسم کی علمی کتابوں کی اشاعت جن کا کوئی گاہک نہیں کس قدر دشوار ہے ''

معارف قرآنیہ | جناب مشتاق احمد خاں صاحب کے نام سے قارئین طلوع اسلام نا واقف نہیں سلسلۂ اصلاح میں آپ کے قابل قدر مضامین رسالہ میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے آپ کا نظریہ اور مسلک واضح ہے آپ قرآن کریم کو مکمل ضابطہ حیات مانتے ہیں اور قرآن کو قرآن ہی سے

سمجھنے کے قائل ہیں۔ اس انداز سے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی تعلیم کو مختلف عنوانات کے ماتحت یکجا جمع کیا جائے اور اس طرح قرآن کریم کی مختلف آیات سے قرآن کا مفہوم متعین کیا جائے۔ آپ نے قرآن کریم کو اس نہج سے سمجھا ہے اور اسی نہج سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے پیشتر ان کی ایک کتاب جذبات توحید کے نام سے شائع ہوئی تھی جس کا تذکرہ طلوع اسلام کے صفحات میں آچکا ہے۔ اب زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے۔ اس میں جناب مؤلف نے حروف تہجی کے لحاظ سے چند عنوانات کو یکجا جمع کیا ہے۔ ہر عنوان کے ماتحت قرآنی آیات اور ان کی مختصر سی تشریح ہے جس سے مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ جناب مؤلف اپنی اس مبارک کوشش میں کامیاب ہیں اور درخورِ تحسین۔ ضلع مظفر گڈھ کی "بے برگ و گیاہ" زمین میں ایسی شادابی قرآن ہی کا اعجاز ہے۔ کتاب متوسط تقطیع کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس گرانی کے زمانہ میں جو کاغذ لگایا گیا ہے۔ از بس غنیمت ہے۔ جماعت المسلمین۔ لیہ ضلع مظفر گڈھ سے ایک روپیہ میں (علاوہ محصول ڈاک) مل سکتی ہے۔

ایک شکایت ہمیں بعض احباب سے ایک جفائے وفا نما کا گلہ ہے جس کا تذکرہ ضروری ہے۔ معارف القرآن کسی صاحب کی خدمت میں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جاتی تاوقتیکہ ان کی طرف سے واضح الفاظ میں فرمائش نہ پہونچ جائے۔ لیکن دو تین احباب نے صاف صاف الفاظ میں خطوط لکھنے کے بعد وی۔ پی واپس کر دئے اور جب ان کی خدمت میں شکایت نامہ لکھا گیا تو خاموش ہو گئے! اب وہ اپنی اس روش کے متعلق خود ہی فیصلہ فرمالیں۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم

(از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز)

[طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۴۱ء میں جناب پرویز کا بصیرت افروز مضمون نجات کا قرآنی نظریہ شائع ہوچکا ہے۔ اس میں نظریۂ ارتقاء کا ضمنی طور پر ذکر آگیا تھا چونکہ یہ موضوع بجائے خویش بہت اہم ہے۔ اس لئے ہماری درخواست پر انھوں نے اس عنوان پر الگ مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ یہ دونوں مضامین فی الحقیقت ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔ دونوں کو سامنے رکھنے سے انسان کی موجودہ اور آئندہ زندگی کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم اس قدر واضح۔ دلنشین اور مدلّل طریق پر سامنے آجاتی ہے جس سے ذہن میں جلاء۔ نگاہوں میں روشنی اور قلب میں نورِ ایمان جگمگا اٹھتا ہے۔ جناب پرویز نے ہمارے سامنے فہم قرآن کی ایک نئی راہ کھول دی ہے جس سے اس قسم کے نظری مسائل بھی زندگی کے عملی شعبوں کی حیثیت سے سامنے آجاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہمیں ان کے تدبر فی القرآن کے نتائج سے مستفیض ہونے کا تا دیر موقعہ عطا فرماتے۔ طلوع اسلام]

انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا ہی عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے جیسے سورج کا اپنے وقت معینہ پر طلوع۔ لیکن اسباب وعلل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب اس کتابِ تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹتا ہے تو اس کی نگہِ استعجاب کا اس مقام پر جا کر رک جانا ضروری ہے جسے وہ انسانی تخلیق کے سلسلہ کی ابتداء سمجھتا ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کہ سب سے پہلا انسان کس طرح وجود میں آگیا؟ اس کا تحیر بجا اور اس کا تعجب درست ہے انسانی تحقیق وتفتیش کا ماحصل، اس کے تمام انکشافات وایجادات کی ہمہ صرف اس قدر ہے کہ وہ کارگہِ عالم کے مختلف پرزوں کی علت ومعلول کی کڑیوں کو دریافت کرلیتا ہے لیکن جہاں اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی آجاتی ہے اس کے بعد اس کی نگہِ تجسس کے سامنے حیرت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ یہ مقام تحیر انسانی

(Theory of Organic Evolution)

علم و تحقیق کی نسبت سے متعین ہوتا ہے۔ یعنی جس قدر علم و بصیرت میں اضافہ ہوتا جائے گا اسی قدر یہ مقام آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر ایک خدا فراموش مادہ پرست اور حق شناس عبدِ مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اول الذکر اس مقام سے اگلی منزل کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے اور اس طرح خود بھی سیدھے راستے سے بھٹکتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے لیکن ایک حکیم مومن وہاں پہنچکر بلا تامل پکار اٹھتا ہے کہ اس سلسلۂ دراز کی ابتداء اس قادرِ مطلق کی حدود فراموش مشیئت اور قیود ناآشنا تدبیر کی رہینِ منت ہے جو تمام اسباب و علائق سے بے نیاز اور جملہ علل و ذرائع سے مستغنی ہے۔ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت و استعجاب کی وہ وادی جو اس خدا فراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ و تار ہو چکی تھی، اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی مشعلِ ایمان و یقین سے جگمگا اٹھتی ہے۔

سب سے پہلا "انسان کس طرح وجود میں آگیا؟ یہ ہے وہ مقام تحیر جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے جب ذہن انسانی ہنوز اپنے عالم طفولیت میں تھا تو وہ بھلا اس پیچیدہ معمہ کو کیسے سلجھا سکتا تھا! وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ یہ کہہ کر اپنے دل کو اطمینان دے لے کہ سب سے پہلے ایک مٹی کا پتلا بنا ہو گا جس میں اللہ نے کسی طرح جان ڈال دی۔ اور پھر اس کی "پسلی چیر کر" اس میں سے اس کے لئے ایک بیوی پیدا کر دی اور یوں یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ لیکن جب انسان اور آگے بڑھ کر اپنے شعور کی دنیا میں آیا تو اس کے عہد طفولیت کی توجیہ اس کے لئے وجہ تسکین نہیں ہو سکتی تھی اس کے اضطراب نے کاوشِ تجسس و طلبِ تحقیق کی صورت اختیار کی اور اس علم الاشیاء کی مدد سے جو اس کی فطرت میں ودیعت کر کے رکھدیا گیا تھا اس نے ان پیچ در پیچ رموز کی گرہ کشائی کی کوشش شروع کی اور رفتہ رفتہ اس کی تحقیقات نے اس نتیجہ کی صورت اختیار کر لی جسے اس نے نظریۂ ارتقاء سے تعبیر کیا۔ اس نے معلوم کیا کہ کائنات میں نہایت منظم و مربوط طریقہ سے ایک سلسلۂ تدرج و تحول جاری و ساری ہے۔ ہر شے خاص قوانین کے ماتحت۔ بتدریج نشو و ارتقاء کے مراحل طے کر رہی ہے اور یوں ایک سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ تحول و تقلب ایسے غیر محسوس انداز سے عمل میں آ رہا ہے کہ گہری تحقیق و کاوش کے بغیر نگاہ اس تک پہنچ نہیں سکتی۔ اور پھر یہ تبدیلی اتنے اتنے لمبے عرصہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے کہ انسانی یادداشت کے لئے اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے اس لئے ان تدریجی تبدیلیوں کے لئے خود صحیفۂ فطرت کے اوراق اور خزائن و دفائن ارضی کے نقوش و آثار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

سائنس نے مذہب کو اپنا حریف سمجھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عصرِ حاضرہ میں سائنس کا مسکن دیارِ مغرب ہے اور علمی دنیا کی بدبختی کہ مغرب کے سامنے مذہب وہ تھا جو علم و بصیرت کا دشمن تھا اس لئے مذہب و سائنس کی آویزش کے متعلق اہلِ مغرب کا یہ فتویٰ کچھ غلط نہ تھا۔ غلطی صرف اتنی تھی کہ انھوں نے مذہب کی تخصیص کی اور جب انھوں نے تخصیص کی تو پھر ہر جگہ یہی مشہور ہو گیا کہ نفسِ مذہب ہی علم و بصیرت کا حریف ہے۔ اسی تعمیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام جیسے سراپا علم و بصیرت پر مبنی اور عقل و دانش کے مؤید مذہب کے متعلق بھی یہی غلط فہمی پھیل گئی۔ وہ دن ارتقائے انسانیت کے لئے انتہائی شوریدہ بختی کا تھا جب اسلام کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ سائنس کا حریف اور توہم پرستی و جہالت کا حامی ہے۔ اس سے بڑا جھوٹ کبھی نہیں بولا گیا۔ اس سے بڑی حماقت "اہلِ علم و عقل" نے کبھی نہیں کی۔ اس وقت ہم اس سے بحث نہیں کرنا چاہتے کہ اس جرم میں خود مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ صرف یہ واقعہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیائے عقل و بصیرت اپنے اس غلط فیصلے کی وجہ سے کس قدر عظیم المرتبت نور سے محروم رہ گئی۔ ورنہ اگر مغرب کے متلاشیانِ حقیقت کے سامنے قرآن آ جاتا تو نہ معلوم دنیا کیا سے کیا ہو جاتی! زیرِ نظر موضوع میں سائنس کا معرکۃ الآرا کارنامہ نظریۂ ارتقاء یعنی اشیائے فطرت میں تدریجی نشو و عروج کی تحقیق ہے۔ ذرا قرآن کریم کے اوراق کو کھولئے اور دیکھئے کہ اس باب میں اس کا کیا ارشاد ہے۔ ہم دیگر اشیائے کائنات سے ہٹ کر اس وقت اپنی توجہ صرف تخلیقِ انسانی کے گوشہ پر مرکوز رکھنا چاہتے ہیں اس لئے کہ سر دست اس عظیم الشان نظریہ کا یہی پہلو ہمارے پیشِ نظر ہے یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم سائنس کی تحقیقات کی کتاب نہیں۔ اس کا اصل موضوع تو تکمیلِ شرفِ انسانیت ہے اس موضوع کی تائید و تبیین کے سلسلہ میں ضمناً اور تبعاً دوسری چیزوں کا بھی ذکر آ جاتا ہے لیکن یہ ذکر چونکہ اس خدائے علیم و حکیم کی طرف سے ہے جو فطرت کا خلّاق اور کائنات کا پروردگار ہے اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس کی طرف سے ضمناً کوئی اشارہ آ جائے اور وہ تحقیق و تفتیش کے بعد (معاذ اللہ) غلط ثابت ہو۔ مسئلہ زیرِ نظر میں بھی اسی طرح قرآن کریم میں ضمنی اشارات آئے ہیں لیکن ان اشارات ہی سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ کیا قرآن کریم جہالت اور توہم پرستی سکھاتا ہے یا اس کی تعلیم علم و دانش کی ان بلندیوں سے بھی آگے لے جاتی ہے جہاں اب تک عقلِ انسانی جا سکی ہے اور اس کے بعد جہاں تک پہنچنا اس کے لئے ممکن ہے۔

اشیائے کائنات کی ابتداء، تدریجی مراحل اور تکمیل کے متعلق قرآن کریم نے ایک اصول بیان فرمایا ہے۔ جو

جو اس تمام بحث و نظر کا نقطۂ اساسیہ ہے (اور جس کا ذکر ہم اپنے مضمون "نجات کا قرآنی نظریہ" مطبوعہ طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۴۱ء میں کر چکے ہیں) ارشاد ہے۔

یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہٗ الف سنۃ مما تعدون ۵ ذالک عالم الغیب والشھادۃ العزیز الرحیم ۵ ۳۲/۶-۵

اللہ ایک امر (اسکیم) کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہ اسکیم (اپنے ارتقائی مراحل طے کرکے) اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے ایک دن (منزل) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ہزار سال ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ ذات جو غیب و حاضر کی جاننے والی غالب اور رحیم ہے۔

مشیت ایزدی کے سامنے ایک اسکیم ہوتی ہے جسے اس کی انتہائی پستی یعنی نقطۂ اولیں سب سے نچلی منزل سے شروع کیا جاتا ہے۔ پھر وہ اسکیم ان خاص قوانین کے ماتحت جو اس کے لئے متعین کئے جاتے ہیں۔ نشوو ارتقاء کے مراحل طے کرتی ہوئی اپنی تکمیل کے نقطۂ آخریں تک جا پہنچتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد "ایام" (Perioda) میں طے ہوتے ہیں۔ ہزار ہزار سال۔ اور دوسری جگہ ہے کہ بعض اوقات پچاس پچاس ہزار سال۔ بیج کو درخت۔ قطرے کو گہر۔ خاک کے ذرے کو انسان بننے کے لئے ان طویل المیعاد مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کارگہ مشیت کے ان عظیم المرتبت امور ((Schemes)) میں سے ایک اہم اسکیم انسان کی تخلیق ہے۔ اس اسکیم کا نقطۂ آغاز طین (درجۂ جمادات) بتایا گیا ہے۔ یہ پہلی اسٹیج ہے۔ وبدا خلق الانسان من طین ۵ ۳۲/۷ (انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی)

طبقۂ جمادات، زندگی کے اس جوہر خصوصی سے عاری ہے جو نشوونما کا کفیل ہے۔ حیات کا سرچشمہ پانی ہے

وجعلنا من الماء کل شیءٍ حی ۲۱/۳۰

اور ہم نے ہر شے کو پانی (الماء) سے حیات عطا فرمائی۔

زندگی نے اپنی آنکھ پانی کی گہرائیوں میں کھولی۔ سائنس کی یہی تحقیق ہے کہ حیات کے جرثومۂ اولیں ((Protoplasm)) کی ابتدا سمندر میں ہوئی ہے اس لئے کہ اس میں اسی نوعیت اور اسی تناسب کے املاح ((Salts)) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔

"پانی اور مٹی کے" امتزاج سے اس جرثومہ نے خلیہ ((Cell)) کی شکل اختیار کی جس کے ہیولی کو

سادہ خلیہ ((Cell)) مرکزیہ ((Nucleus)) اور ہیکلہ (Cell-Body) سے مرکب ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں طین لازب (چپکتی مٹی) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ ۳۷/۱۱

ہم نے انھیں طین لازب سے پیدا کیا ہے

یہ وہ طین لازب ہے جو تالابوں کی تہ میں اور جوہڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے جب پانی سوکھ جاتا ہے تو یہ سیاہ رنگ کی مٹی بڑی سخت ہو جاتی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (۱۵/۲۶، ۵۵/۱۴)

اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے

مٹی اور پانی کی اس آمیزش سے حیات کی ابتدا ہوئی۔ ان خلیات (Cells) میں ایک لیسدار مادہ (Nucleus) زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات اپنے اندر لئے ہوتا ہے۔ جیسے ایک ننھا سا بیج ایک تناور درخت کو اپنے اندر سمیٹے نمود شگفتگی کے لئے ہمہ تن اضطراب ہو حیات کا یہ نقطۂ آغاز وہ نفسِ واحدہ ہے جس سے شجرِ زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ایک خلیہ (Cell) خاص مقدار تک پہنچ کر جوشش نمو سے خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جنھیں (Daughter Cells) کہا جاتا ہے اس نفسِ واحدہ سے وحدتِ خلق کا عظیم الشان اور محیر العقول فلسفہ متجسس نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے۔ وحدتِ خالق اور وحدتِ خلق قرآنی تعلیم کے وہ بنیادی ستون ہیں جن پر انسانی تمدن۔ بلکہ یوں کہئے کہ خود انسانیت کی ساری عمارت قائم ہے اس نفسِ واحدہ سے مخلوق کی شاخیں پھوٹیں اور ایک طویل القامت درخت کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئیں۔ ہر شاخ، مخلوق کی ایک الگ نوع (Species) ہے جو بڑھتی پھولتی۔ پھلتی۔ اپنی اپنی سمت میں نشو و ارتقاء کی منازل طے کرتی جا رہی ہے۔ ان تمام شاخوں میں سب سے سربلند۔ انسان کی شاخ زندگی ہے جو اس نفس واحدہ کے ننھے سے بیج سے مختلف مراحل طے کرتی درجہ بدرجہ۔ قدم بقدم اس بلندی تک آ پہنچی ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝ ..... وَاللَّهُ أَنبَتَكُم مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا (۷۱/۱۳، ۱۷)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزومند نہیں ہوتے! اور یقیناً اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گذار کر پیدا کیا ہے[۱] اور اللہ نے تمہیں

۱؎ قرآن کریم کا معجزانہ انداز بیان ملاحظہ فرمائیے! سلسلۂ ارتقا کی طرف اشارہ کر کے وقار و تمکن کی آرزوؤں کو سامنے لایا گیا۔ وقار اسے ہی نصیب ہوتا ہے جو اپنے قدم جما کر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرے۔

زمین سے (درخت کی طرح) اگایا ہے۔

درجہ بدرجہ۔ طبقاً طبقاً یہاں تک پہنچا دیا۔ لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۸۴/۱۹ (تم یقیناً ایک حالت سے دوسری میں تبدیل (سوار) ہوتے جاؤ گے)۔ اس خود بینی نفسِ واحدہ سے سلسلۂ تخلیق انسانی آگے بڑھا۔ اس نشأۃِ اول کے بعد وہ نفسِ واحدہ مختلف منازل میں ٹھہرتا ہوا آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ وہ اس مستقل مکان میں آپہنچا جو بشریت کا پیکر ہے۔ مستقل اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ حیاتِ ارضی (یعنی ہماری موجودہ زندگی) کی آخری قیامگاہ ہے۔ ورنہ حیات تو ایک جوئے رواں ہے جسے ابھی اور آگے بڑھنا ہے۔

وھو الذی انشاکم من نفس واحدۃ فمستقر ومستودع ط قد فصلنا الاٰیات لقوم یفقھون ۰ ۶/۹۹

یہی ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے قرار پانے کی جگہ (مستقر) اور سپردگی کا مقام (مستودع) ہے۔ بلاشبہ ہم نے اپنی آیات سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے تفصیل کے ساتھ بیان کر دئے ہیں۔

غور فرمائیے۔ قرآن کریم اس "آخری جائے قرار" کو بھی صرف امانت گاہ (مستودع) قرار دیتا ہے۔ یعنی وہ پیکر جس میں حیات بطور امانت کے رکھی گئی ہے۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ اس انتقال مکانی یعنی ایک مکان استقرار (ٹھہرنے کی جگہ) سے دوسری منزل تک پہنچنے میں قرنہا قرن (الف سنۃ) گذر گئے۔ اور یوں ابتدائی مرحلہ (Life Cells) کے بعد وہ مقام آگیا جہاں تخلیق کا سلسلہ بذریعۂ تناسل شروع ہوا

ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماءٍ مھین ۳۲/۸

پھر اس کی (انسان کی) نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

یعنی ان تمام سابقہ طبقات سے گذر کر (ثم) ہزارہا سال کی تشکیل و تدبیر کے بعد۔ اس کا سلسلہ ایک حقیر پانی کے نچوڑ سے جاری رکھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نر اور مادہ کا امتیاز محسوس طور پر ہمارے سامنے آگیا۔

واللہ خلقکم من تراب ثم من نطفۃ ثم جعلکم ازواجاً۔ ۳۵/۱۱

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔ پھر تمہیں جوڑے سے بنا دیا۔

یعنی اس مقام پر خلیاتِ حیات (Life Cells) میں جنسی تخلیق (Sexual Reproduction) کا جوہر نمایاں ہو گیا۔ یہ جرثومے (Germ Cells or Gametes) دو حصوں میں

تقسیم ہو گئے۔ ایک (Ovum) یعنی مادہ کا خلیہ اور دوسرا (Spermatozoon) نر کا خلیہ (نطفہ جنکو ازواجا) اس مقام (Stage) میں جو مخلوق پیدا ہوئی ان میں رینگنے والے اور پاؤں کے بل چلنے والے حیوانات سب شامل ہیں۔

واللہ خلق کل دابۃ من ماء فمنھم من یمشی علی بطنہ ومنھم من یمشی علی رجلین ومنھم من یمشی علی اربع ۲۴/۴۵

اللہ نے ہر جاندار حیوان کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو چار پاؤں پر چلتا ہے۔

صرف رینگنے اور پاؤں پر چلنے والے ہی نہیں بلکہ پرندے بھی یعنی وہ تمام مخلوق جس کا سلسلۂ تخلیق بذریعۂ تناسل آگے بڑھتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ زندگی کی اس شاخ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ادھر ادھر پھوٹیں۔ اس لئے یہ مختلف اقسام کی مخلوق دراصل ایک ہی نوع کی مختلف شکلیں ہیں اس لئے فرمایا۔

وما من دابۃ فی الارض ولا طٰئر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ما فرطنا فی الکتٰب من شیء ثم الی ربھم یحشرون ۰ ۶/۳۸

اور زمین میں چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں پروں سے اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمہاری ہی طرح گروہ (امت) نہ ہو۔ اور ہم نے نوشتہ (الکتاب) میں کوئی بھی بات فروگذاشت نہیں کی پھر (سب) اپنے رب کے حضور جمع کئے جائیں گے۔

اس نفسِ واحدہ نے اس جاتے قرار میں بھی قرنہا قرن گذارے اور ان تمام مختلف شاخوں میں سے ایک شاخ اوپر کو ابھری یہ پیکر انسانی کی شاخ تھی ثم سوٰہ ونفخ فیہ من روحہ ۳۲/۹

(پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی) یعنی اس "شاخ" کو ہر طرح سے درست کیا۔ اس میں مناسب صلاحیت و استعداد پیدا کی۔ اسے حشو و زوائد سے پاک کیا۔ سنوارا اور آگے بڑھایا۔ جب اس میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں تو اسے درجۂ حیوانیت سے آگے بڑھا کر اس میں صفات الٰہیہ کا شمہ ڈالا۔ اور اب وہ دیکھنے، سننے اور سمجھنے سوچنے والا انسان بن گیا وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون ۳۲/۹ اور اس نے تمہارے لئے سمع و بصر اور قلب بنایا۔ لیکن تھوڑے ہیں جو شکر گذار ہیں) یہ ہے وہ انسان جو زمین (مٹی) سے پیدا ہوا اور زمین پر بسایا گیا۔

هو انشاکم من الارض و استعمرکم فیھا... ۱۱/۶۱

وہی ہے جس نے تمہیں زمین (مٹی) سے پیدا کیا اور پھر اسی میں تمہیں بسا دیا۔

ان حقائق پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کیا قرآن کریم کی تعلیم علم و بصیرت اور سائنس کے انکشافات کے خلاف (معاذ اللہ) توہم پرستی اور افسانہ طرازی پر مبنی ہے! حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے) سائنس کے نظریات جب کسی یقینی درجہ پر پہنچ جائیں گے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ ان اشارات کے خلاف ہوں جو قرآن کریم میں اس باب میں ضمنی طور پر آ گئے ہوں۔ اس کے بعد اس امر کا بھی اندازہ فرمائیے کہ جس صاحب علم و بصیرت محقق کے سامنے قرآن جیسی روشنی ہو اسے اپنی تحقیقات کے میدان میں کس قدر آسانیاں ہو سکتی ہیں۔ یورپ کا محقق اگر وادیٔ تحقیق میں۔۔ قدم رکھتا ہے تو اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے اس لئے اسے محض اپنے قیاس کی مدد سے راستہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ برسوں ایک راہ پر چلتا رہے اور بعد میں جا کر معلوم ہو کہ قدم غلط اٹھ رہے تھے اس طرح اس کی تمام محنت رائگاں اور سعی و کاوش برباد چلی جائے گی۔ اس کے برعکس جب ایک حکیم مومن اس وادی میں آئے گا تو قرآن کریم اس کے سامنے منزل بھی نمایاں کر رہا ہوگا اور نشانِ راہ بھی متمیز۔ اس لئے کہ اسے اپنی قیاس آرائیوں سے کام نہیں لینا پڑیگا بلکہ وہ پورے حتم و یقین کے ساتھ جادہ پیما ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان حکماء[۱] نے جس زمانے میں اشیائے فطرت کی تحقیق و تدقیق کی طرف توجہ کی تو یورپ جن منازل کو باایں ہمہ اسباب و ذرائع۔ کہیں صدیوں کی محنت شاقہ کے بعد طے کر سکا ہے۔ انھوں نے بڑی آسانی سے قلیل ترین عرصہ میں ان مراحل کو عبور کر لیا۔ لیکن جب مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن اوجھل ہو گیا تو تسخیر فطرت (علم الاشیاء) جیسا اہم شعبہ جس کی بنا پر انسان مسجودِ ملائک

صلہ سائنس کے میدان میں مسلمان حکماء کے کارنامے ایک جداگانہ موضوع ہے۔ اسکے لئے میرا مضمون "سائنس اور اسلام" مطبوعہ طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۴۸ء ملاحظہ فرمائیے میں نے اپنے سابقہ مضمون "نجات" میں مسئلہ ارتقاء کے متعلق مسلمان حکماء کا بھی ذکر کیا ہے مزید تفصیلات مغربی مصنفین کی کتابوں سے بھی مل سکتی ہیں مثلاً (Inorganic Chemistry by Holmyard) کا مقدمہ دیکھئے اسی مصنف نے مسلمان اور سائنس کے عنوان پر ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ نیز آرنلڈ کی مشہور کتاب (Legacy of Islam) بھی اس باب میں مفید ہے۔

قرار پا یا تھا "دنیادار" کافروں کے حصہ کی چیز سمجھ لی گئی جس کا نتیجہ آج ساری دنیا کے سامنے ہے۔

لیکن اس مقام پر ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو سامنے لے آیئے جس کا ذکر ابتدا میں کیا جا چکا ہے یعنی قرآن کریم تاریخ وجغرافیہ۔طبیعیات دکیمیا۔حیاتیات وطبقات الارض کی کتاب نہیں وہ تو ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جس سے انسانیت نشوو ارتقاء کے مراحل طے کرکے اس مقام پر پہنچ جائے جو اس سفر زندگی کا مقصود ہے۔اس میں اگر ان علوم و فنون کے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں تو ان سے مقصود اس منزل کی طرف راہ نمائی اور اس نصب العین کی طرف توجہات کا مرتکز کرنا ہے۔مثلاً اسی نظریۂ ارتقاء کو لیجئے۔یورپ کے محققین نے جب یہ دریافت کرلیا کہ خاک کا ذرہ کس طرح اپنی ارتقائی منازل طے کرکے انسان کے مقام تک آ پہنچا ہے تو انھوں نے اس باب (Chapter) کو ختم کردیا اور سمجھ لیا کہ انسان کا موجودہ پیکر اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی ہے اس کے بعد کچھ نہیں۔لیکن قرآن کریم نے اس سلسلۂ دراز کی مختلف کڑیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد نوع انسانی کے تجسس کو اس طرف پھیر دیا کہ انسان کی موجودہ زندگی اس سلسلہ کی آخری کڑی نہیں بلکہ اسے ابھی قانونِ ارتقاء کے مطابق آگے بڑھ کر کسی اور منزل تک پہنچنا ہے۔اس کی موجودہ منزل سے اگلی منزل کا نام حیاتِ اخروی ہے۔

وہ قانونِ ارتقاء کو بیان ہی اس انداز سے کرتا ہے کہ حیاتِ آخروی یا نشاۃِ ثانیہ ایک منطقی نتیجہ (Logical Inference) کی حیثیت سے خود بخود سامنے آجائے۔غور فرمایئے کہ اس منطقی نتیجہ تک بے اختیار پہنچنے کے لئے قرآن کریم نے کس اسلوب سے صغریٰ وکبریٰ قائم کیا ہے۔اس کی تعلیم ہے کہ

(۱) کائنات کی کوئی شے بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی کہ کسی حکیم کا کوئی فعل عبث نہیں ہوتا۔

(۲) ہر شے کو اپنی ابتداء سے انتہا (منزل مقصود) تک پہنچنے کے لئے مختلف مدارج طے کرنے ہوتے ہیں۔

(۳) یہ تدریجی مراحل ایک محکم تدبیر (Well-Thought-of-Scheme) کے مطابق طے پاتے ہیں۔

(۴) قانون ارتقاء حیات (Law of Organic Evolution) کے ماتحت۔اس قسم کی ایک اسکیم اپنے تدریجی مراحل طے کرتی ہوئی مقام بشریت تک پہنچی ہے۔

(۵) اس اسکیم کی منزلِ مقصود یہی مقام نہیں بلکہ اسے ابھی آگے بڑھنا ہے۔

(۶) اس اگلی منزل کا نام حیاتِ اخروی ہے۔

اب دیکھئے کہ قرآن کریم کس طرح ان تدریجی مراحل کے تذکرہ کے بعد ذہنِ انسان کو نشاۃِ ثانیہ کی طرف منتقل کرتا ہے۔ فرمایا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝
اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا (یعنی زندگی کی ابتدا اس طرح ہوئی)

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝
پھر ہم نے اسے "نطفہ" بنایا۔ ایک ٹھہر جانے اور جماؤ پانے کی جگہ میں۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً۔
پھر نطفہ کو ہم نے "علقہ" بنایا (جونک کی شکل)

فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً۔
پھر "علقہ" کو ایک گوشت کا ٹکڑا کر دیا۔

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا۔
پھر اس "مضغہ" کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنایا

فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا۔
پھر ڈھانچے پر گوشت کی تہ چڑھا دی

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ
پھر (دیکھو) اسے کس طرح ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا کر نمودار کر دیا۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝
تو کیا ہی برکتوں والی ہستی ہے اللہ کی پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر پیدا کرنے والا

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝
پھر دیکھو! ان مراحل کے بعد، تم سب کو ضرور مرنا ہے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ [۲۳ / ۱۶-۱۱]
پھر مرنے کے بعد ایسا ہونا ہے کہ قیامت کے دن اٹھائے جاؤ

سطح بین نگاہوں کو انسان کی نشاۃِ ثانیہ کے خلاف یہ اعتراض نظر آتا تھا کہ جب اس عناصری ترکیب کا شیرازہ بکھر جائے گا تو اس کے بعد ایک ترتیبِ جدید کیسے ہو سکے گی! اور صرف سطح بین "نگاہوں" پر ہی کیا موقوف ہے۔ آج یورپ کے حکماء جنہیں دنیا علم و بصیرت کی انتہائی بلندیوں پر خیال کرتی ہے۔ اسی جہالت میں گرفتار ہے اس لئے کہ جس طرح وہ پہلے راستوں میں محض اپنے ذہن کی قیاس آرائیوں کی مدد سے چلے تھے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے تھے۔ وہ اس منزل سے آگے بھی اپنے تصورات کی ہی روشنی میں بڑھنا چاہتے ہیں اور ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جس طرح ایک مدت کی صحرا نوردیوں کے بعد یہ لوگ حقیقت کے ایک گوشہ تک

پہنچے ہیں۔ بالآخر انھیں نشاۃ ثانیہ کے متعلق بھی وہیں آنا پڑے گا۔ جہاں قرآن دعوت دیتا ہے۔ کہ قرآن کی دعوت جہل اور توہم پرستی کی دعوت نہیں۔ علم و بصیرت کی دعوت ہے حتم، یقین کی دعوت ہے وہ اس مشکل کو ایک لفظ میں حل کرکے رکھ دیتا ہے۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۳۱/۲۸

تمہاری (موجودہ) پیدائش اور نشاۃ (ثانیہ) ایک نفس واحدہ کی مثل ہے[1]۔

جو خدا زندگی کے اولیں جرثومہ (Life Cells) سے موجودہ ہیئت کا انسان بنا سکتا ہے اس کے لئے اسے اس کے بعد ایک دوسری زندگی عطا کرنے میں کیا مشکل ہو سکتی ہے۔

لیکن قرآن کریم صرف اتنا بتا دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا کہ اس زندگی کے بعد آئندہ زندگی بھی ہے۔ بلکہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کا مقصد انسان کو یہ بتانا ہے کہ وہ کس طرح موجودہ دور کی ارتقائی منازل طے کرکے آگے بڑھ سکتا ہے۔ سارا قرآن اسی اصولی مقصد کی تشریح ہے۔ جس کے لئے وہ ایک مکمل نظام عطا کرتا ہے وہ اقوام سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں پیش کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ ایک تاریخ کی کتاب ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کے اعمال کے انجام و عواقب سے قانونِ فنا و بقا پر شہادت لائے۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں بتا دیا کہ

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۶۷/۲

اس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش ہو سکے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے

یعنی فنا و بقا (موت و حیات) کا قانون اس لئے متعین کیا گیا ہے کہ وہ دیکھ لے کہ تم میں سے کون ایسے کام کرتا ہے جو اس قانون کے مطابق زندہ رہ سکے اور کون ایسا ہے جو ہلاک ہو جائے۔ وہ برملا کہتا ہے کہ یہ واضح اور غیر مبہم قانون اس لئے کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے تاکہ

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۸/۴۲

جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔

---

[1] ان اشارات کی تفصیل "معارف القرآن" کی آئندہ جلدوں میں اپنے اپنے مقامات پر ملے گی۔ انشاء اللہ

وہ قانونِ ارتقاء کے اس بنیادی اصول کو مختلف گوشوں اور متنوع پہلوؤں سے دل نشین کراتا ہے کہ صرف وہ نوع باقی رہ سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو۔ آگے وہی بڑھ سکتی ہے جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی استعداد پیدا کر لے اس طرح وہ دیگر انواع سے خود انسانوں پر استشہاد کرتا ہے۔ ان سے کہتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم الشان درخت کو دیکھو اور غور کرو کہ کتنی شاخیں تھیں جو سوکھ سوکھ کر گر گئیں۔ کتنے پھول تھے جو مرجھا مرجھا کر زمین پر آگئے اور راستہ چلنے والوں کے پاؤں کے نیچے آکر مسلے گئے۔ اس کے برعکس کتنی شاخیں ہیں جو سرسبز و شاداب ہوئیں۔ کیسے کیسے شگفتہ و بشاش پھول لائیں اور کیسے کیسے نفیس و لطیف پھل دئے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اس قانون پر نگاہ ڈالو اور پھر سوچو کہ اقوامِ سابقہ اور مِلل گذشتہ کا کیا حشر ہوا۔ اس کا ارشاد ہے کہ مختلف انواع کی طرح قوموں کی موت و حیات کا بھی یہی قانون ہے۔ جو قوم زندگی کی اہل نہیں رہتی۔ فنا ہو جاتی ہے۔ اسے کوئی رعایت نہیں دیجاتی۔ اس فیصلہ الٰہی (یعنی ان کے اعمال کے نتائج کے وقتِ معینہ پر برآمد ہونے) میں ذرہ برابر بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾

اور (دیکھو) ہر امت کے لئے ایک معینہ وقت ہے جب کسی امّت کا وہ وقت آگیا تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتی ہے نہ ایک گھڑی آگے۔

اس اصولی نکتہ کو بیان فرما دینے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتا دیا کہ زندہ اور باقی رہنے کے لئے کیا قانون مقرر ہے فرمایا۔

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۙ فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٥﴾

اے اولادِ آدم (نوعِ انسانی)! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے رسول تم میں پیدا ہوں اور میری آیات (قانون) تمہیں پڑھ کر سنائیں تو جو کوئی (اس قانون کے مطابق) اپنے آپ کو اللہ کی حفاظت میں رکھے گا (تقویٰ) اور اپنے میں (باقی رہنے کی) صلاحیت پیدا کرے گا (اصلح) تو اس کے لئے (فنا ہونے کا) کسی قسم کا اندیشہ ہوگا نہ غمگینی۔

یہ تو وہ ہیں جو باقی رہیں گے۔ آگے بڑھیں گے جنہیں ہلاکت و بربادی کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ برعکس ان کے۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٦﴾

لیکن جو لوگ ہماری آیات (قانون) کی تکذیب کریں گے اور ان (آیات۔ قانون) سے سرکشی اختیار کرینگے

تو وہ اہل جہنم ہونگے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

غور فرمائیے! پہلی آیت میں قوموں کی موت و حیات کا ایک اصولی قانون بیان فرمایا۔ اس کے بعد اس کی وضاحت فرمادی کہ ہلاکت سے مامون اور بربادی سے بے خوف رہنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ کونسا نظام ہے جس پہ چل کر انسان امن و سلامتی کی جنت میں پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت اس نظام کی تشریح کا موقعہ نہیں۔ یہاں تو صرف اتنا دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے اس نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس ضابطہ کو نصب العین حیات بنایا جائے جو بجانب اللہ۔ اس کے انبیاء علیہم کی وساطت سے انسانوں کو ملا ہے۔ اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی جس سے وہ فنا و برباد کر دینے والی مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے گا۔ اور یوں انسان ہلاکت نفس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو اللہ کی حفاظت میں لے آئے گا (اصلح و تقویٰ) جب یہ صورت پیدا ہو جائے گی تو پھر انسان ہلاکت سے محفوظ و مصئوں ہو جائیگا پھر اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں رہے گا (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْن) اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو خدا کا قانون استخلاف و استبدال (Law of Succession and Substitution) اپنا اٹل فیصلہ صادر کردیگا اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم آجائے گی۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ

كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ۝ (۶/۱۳۴)

اور تمہارا پروردگار بے نیاز اور رحمت والا ہے اگر وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) چاہے

تو تمہیں ہٹادے اور تمہارے بعد جس کو (اپنے قانونِ مشیت کے ماتحت) چاہے تمہارا جانشین بنادے

جس طرح ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اٹھا کھڑا کیا۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ قانونِ ارتقاء کی اصل یہ ہے کہ وہی نوع باقی رہ سکتی اور آگے بڑھ سکتی ہے جس میں حفظِ نفس اور بقائے نوع کی صلاحیت و استعداد موجود ہو۔ جو ان تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کر سکے جو اسے مٹانے پر آمادہ ہوں۔ جو ناسازگار ماحول، نامساعد فضا اور ہلاکت آفریں اسباب کی مدافعت کا سامان اپنے پاس رکھتی ہو۔ دیگر انواع کی طرح، نوعِ انسانی بھی اسی قانون کے تابع ہے۔ وہ اقوام و ملل جنھوں نے سامانِ مدافعت اور قوتِ محافظت کو کھو دیا۔ ہلاک ہوگئیں جنھوں نے اس قوت کو قائم رکھا ہلاکت سے محفوظ رہیں قانونِ ارتقاء کا اتنا

حصہ انسان کی طبعی زندگی (Physical Life) سے متعلق ہے اور اس اعتبار سے انسان اور اس کی پہلی کڑی (دیگر حیوانات) میں کچھ فرق نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ انسان دیگر حیوانات سے ایک قدم آگے ہے اور یہی وہ مقام ہے جو اسے اُفقِ حیوانیت سے بلند کرکے درجہ انسانیت میں پہنچاتا ہے وہ مقام جہاں قرآن کریم نَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا (ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی) سے اسے دیگر حیوانات سے ممتاز کر دیتا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو نفسِ حیوانی سے یقیناً جداگانہ ہے۔ اسے آپ نفسِ انسانی کہیئے۔ (Mind) کہیئے۔ روح کہیئے۔ خودی سے تعبیر کیجیئے۔ بہرحال نفسِ حیوانی یا محض طبعی زندگی سے کچھ اور کہنا پڑے گا۔ لہٰذا وہ قانونِ ارتقاء جو انسان سے پیشتر تمام انواع میں محض طبعی زندگی (Physical Life) سے متعلق تھا۔ اب طبعی زندگی کے علاوہ نفسِ انسانی کو بھی اپنے احاطہ اثر و نفوذ میں لے آیا یعنی جس طرح انسان کو اپنی طبعی زندگی کے حفظ و بقا کے لئے تمام مخالف قوتوں سے مقابلہ کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنی ضروری ہے۔ اسی طرح اپنے نفس کی حفاظت اور نشو و ارتقاء کے لئے بھی تمام متصادم و متحارب قوتوں کے خلاف اپنے اندر قوت پیدا کرنا لازمی ہے۔ اس کا نام "استحکامِ خودی" ہے اگر انسان کی تگ و دو کا مقصود محض طبعی زندگی کا استحکام ہوتا تو ظاہر ہے کہ فرعون کے استہلاک کے لئے کسی موسےٰ (علیہ السلام) کے بھیجنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مادی زندگی کی حفظ و بقا کی ضرورت نہیں اس لئے اس میں قوت و شدت پیدا کرنا بے معنی ہے فوج کی حفاظت کے لئے قلعہ کی دیواروں کا آہنی و سنگین ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے انسان کے لئے ضروری ہے کہ نفسِ انسانی اور پیکرِ انسانی دونوں میں استحکام پیدا کرے تاکہ قانونِ ارتقاء کی رُو سے یہ ہلاک نہ ہو جائیں لہٰذا جس طرح محض مادی زندگی کی نشو و ارتقاء ہی منتہائے نگاہ نہیں اسی طرح کوئی ایسا قدم جس میں مادی زندگی کے استحکام سے تغافل برتا جائے۔ درجۂ استحکامِ انسانیت نہیں ہو سکتا۔ نفسِ انسانی سے چشم پوشی کرکے محض طبعی زندگی کو مقصود نظر سمجھ لینا کفر (یعنی غیر فطری زندگی) ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ

اور جو لوگ کفر کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ (دنیاوی متاع سے) اس طرح متمتع ہوتے اور کھاتے (پیتے) ہیں جس طرح حیوان (سو) ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

یعنی ان کا مقصدِ زندگی محض طبعی حیات کی پرورش اور حفظ و بقا ہوتا ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں جو قوم تحفظ نفس یعنی ارتقائے انسانیت سے یوں غفلت برت لے۔ بھلا وہ ہلاکت و بربادی سے کیسے بچ سکتی ہے اس لئے اس

سے اگلی آیت میں فرمایا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۴۷/۱۳

اور کتنی ہی ایسی بستیاں تھیں (جن کے رہنے والے) تمہاری بستی والوں سے جنھوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا کہیں زیادہ سخت قوت رکھتے تھے ہم نے انھیں ہلاک کر دیا اور انھیں کوئی مددگار نہ مل سکا۔

یہ کیوں! اس لئے کہ

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۴۷/۱۴

کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے واضح دلائل پر قائم ہو اس کی مانند ہو سکتا ہے جس کے برے اعمال اسکی نگاہوں میں مزین ہو گئے اور ان لوگوں نے اپنی خواہشات کی ہی اتباع (شروع) کر دی

یعنی جس شخص نے اللہ کے ضابطۂ حیات کے بجائے اپنے خیالات و نظریات کو شاہراہِ عمل بنا لیا۔ وہ کبھی ہلاکت سے نہیں بچ سکتا اس لئے کہ وہ قانونِ ارتقاء جو انسانیت کے تحفظ اور نشو و عروج کے لئے ضابطہ ہے صرف خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت ہے۔ انسانی خواہشات اور قیاسات اس ضابطہ کی جگہ نہیں لے سکتے یہ تو تھی محض طبیعی زندگی کی حفاظت کو منتہائے نگاہ بنانے والوں کی کیفیت۔ اس کے برعکس طبیعی زندگی کے لوازم سے چشم پوشی کر کے محض "روحانیت" کی ترقی و تصاعد کے لئے بزعم خویش سعی و کاوش میں زاویہ نشینی اور سر زیری اختیار کر لینا بھی قانونِ ارتقاء کی رو سے غلط اندیشی ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ قرآن کریم نے رہبانیت کے متعلق واضح کر دیا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے متعین فرمودہ اندازِ زندگی نہیں بلکہ انسانوں کا خود ساختہ نظریۂ حیات ہے رہبانیت سے مقصود آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلے جانا نہیں۔ بلکہ رہبانیت اس زاویہ نگاہ اور روش زندگی کا نام ہے جس میں مادی دنیا سے تنفر پیدا کر لیا جائے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں نفسِ انسانی کے تحفظ و بقا اور عروج و ارتقاء کے لئے تاکید فرمائی ہے اس کے ساتھ ہی طبیعی زندگی کے استحکام کے لئے مادی قوتوں کے حصول و استبقاء کو بھی جزو لاینفک قرار دیا ہے اور اس طرح قانونِ ارتقاء کے ماتحت ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات عطا فرما دیا ہے جس میں انسان اپنی موجودہ منزل میں بھی اپنے آپ کو قائم رکھ سکے اور اس کے بعد کی منزل کی طرف بڑھنے کی صلاحیت بھی پیدا کرے مغرب نے قانونِ ارتقاء کو محض طبیعی زندگی تک محدود کر لیا جس کا نتیجہ۔ جیسا کہ مذکورہ صدر آیۂ جلیلہ میں بتایا گیا ہے جہنم کے سوا اور کچھ نہ نکلا (والنار مثوی لهم) حالانکہ اسے خود اقرار ہے کہ "طبیعی ارتقاء میں نفس انسانی

انسانی قیاس آرائیوں کو "زین" قرار دیکر طبیعی (مادی) زندگی سے مجرمانہ تغافل برتا جس کا فطری نتیجہ ضعف و ناتوانی تھا طبیعی (مادی) زندگی میں یوں موت واقعہ ہوگئی۔ اور چونکہ "بقائے نفس" کا طریق بھی یکسر غیر فطری تھا اس لئے اس شعبہ میں بھی فریب نفس کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا خسر الدُّنیا و الآخرۃ وذالک الخسران المبین۱
طبیعی زندگی کے تحفظ و بقا کا راز تسخیر فطرت میں مضمر ہے جو قرآن کریم کے ایک ایک صفحہ سے ظاہر ہے۔ اور نشو و ارتقائے نفس انسانی ان آئین و ضوابط کی پابندی سے مشروط ہے جو قوانین الٰہیہ کہلاتے ہیں اور یہ بھی قرآن ہی کے اندر ہیں۔ یورپ نے شق اول (تسخیر فطرت) کے راز کو پالیا لیکن شق ثانی سے کفر برتا حالانکہ وہاں کے محققین کو خود اعتراف ہے کہ سلسلہ ارتقاء میں مادیات کے علاوہ اخلاقیات کو بھی کم دخل نہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ارتقاء (Evolution) کے عنوان کا مقالہ نگار اپنے مضمون کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے۔

"حب وطن مذہب۔ آرٹ سائنس اور لٹریچر کا بھی (میزان) بقا میں وزن ہے اور یہ سلسلہ ارتقاء میں بڑا مفید کام کرتے ہیں (اس سلسلہ میں) اخلاق کوئی غیر متعلق خارجی قوت کی حیثیت نہیں رکھتا جو ایک مستبد اور بیگانہ اخلاق آفاقی نظام کے خلاف برسرپیکار ہے بلکہ یہ (اخلاق) خود ارتقاء کی تخلیق ہے اور سلسلۂ ارتقاء کے تدریجی تغیرات کو صحیح سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک اہم قوت۔ ہمیں امید بلکہ یقین ہے کہ وہ تہذیب جو عدل حریت۔ آئین و ضبط اور مستحکم اخلاقیات پر مبنی ہیں آخر الامر سب سے زیادہ کامیاب اور دیرپا ثابت ہونگے۔

اے کاش یورپ کے سامنے قرآن ہوتا تو وہ دیکھتا کہ وہ کونسی تہذیب ہے جو عدل۔ حریت نظم و ضبط اور مستحکم اخلاقیات پر مبنی ہے! اور اگر وہ قرآن کریم کی رو سے ان الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ لیتا تو آج اس طرح برباد نہ ہوتا کہ اس کی بربادی بھی قانون ارتقاء ہی کے ماتحت ہو رہی ہے۔ انسان کے تحفظ کے لئے اس کے نفس خودی کا تحفظ ضروری ہے اور اس کا تحفظ اسی تہذیب (روش زندگی) سے ہو سکتا ہے جو عدل حریت

---

۱ یاد رکھئے کہ اقوام کی موت یہ نہیں ہوتی کہ ان میں کوئی سانس لینے والا باقی نہیں رہتا۔ سانس بند ہو جانے سے افراد کی طبیعی موت واقعہ ہوتی ہے۔ اقوام کی موت ان کی۔۔۔۔ خودی (انسانیت) کی موت ہے اور یہ وہ موت ہے جو ہم پر مدت سے مسلط ہو چکی ہے۔

نظم وضبط اور محکم اخلاقیات پر مبنی ہو۔ صرف مادی اسباب ولوازم سے نہیں ہو سکتا وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّن قَرْيَتِكَ .... أَهْلَكْنَاهُمْ کتنی بستیاں ایسی تھیں جو (مادی) قوت میں تم سے کہیں زیادہ سخت تھیں۔ اللہ کے قانونِ نشا و بقا نے انھیں ہلاک کر دیا تو تم اس کی گرفت سے کیسے بچ سکتے ہو! اگر اس ہولناک قیامت صغریٰ کے بعد جس کا مظاہرہ آج مغرب و مشرق میں ہو رہا ہے۔ انسان نے قانونِ ارتقاء کی اس شق کو پا لیا کہ انسانیت کا تحفظ قوانین حیوانیت سے نہیں بلکہ "قوانین انسانیت" ہی سے ہو سکتا ہے تو پھر وہ نیا نظام (New Order) قائم ہو سکے گا جسے آج دنیا اس تڑپ اور خلش سے ڈھونڈ رہی ہے۔ اس وقت دنیا دیکھے گی کہ یہ نظام کوئی نیا نظام نہیں بلکہ وہ پرانا نظام ہے جو آج سے چودہ سو برس پیشتر قانونِ ارتقاءِ انسانیت کی شکل میں قرآن کریم نے انسانوں کو عطا کیا تھا۔ اگر اس قدر تباہی اور بربادی کے بعد بھی انسان نے اس قانون کو پہچان لیا تو انسانیت کے لئے یہ سودا مہنگا نہیں ہوگا کہ

خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

لمعات

اشاعتِ سابقہ میں ہم نے روزوں کے ذکر میں ضمناً اس حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی تھی کہ جب تک اعمال کو اُن کے نتائج سے نہیں پرکھا جائے گا مسلمان لاکھ رسوم و ظواہر کے پابند رہیں ان کا کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ ہماری یہ آواز صدا بصحرا بن کر نہیں رہ گئی۔ اس نے بہت سے ذہنوں کو سوچنے پر آمادہ اور بہت سے قلوب کو سمجھنے کے لئے مضطرب بنا دیا۔

سمجھنے کے خواہاں حضرات کی طرف سے ایک بات اور پیش کی گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہبی اعمال و عبادات سے ثواب حاصل ہوتا ہے اور ثواب کوئی ایسی شئے نہیں جسے محسوس طور پہ ناپا اور تولا جا سکے۔ اس لئے ہمارے اعمال رائگاں نہیں جا رہے ہیں۔ ان سے ثواب ملتا ہے جو آخرت کی دستاویزات میں سامنے آ جائے گا۔

ثواب سے کسے انکار ہے اور کون اس کا منکر ہو سکتا ہے! لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ثواب کسے کہتے ہیں! اگر آپ اس کا مفہوم قرآن کریم سے متعین کر لیں تو پھر جو کچھ ہم کہتے ہیں اور بھی نمایاں طور پہ سامنے آ جائے گا۔ اس کا مفہوم متعین کرنے سے پیشتر چند الفاظ تمہیداً عرض کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

جس زمانہ میں کوئی قوم زندہ ہوتی ہے تو اس کی نگاہوں کے سامنے زندگی کا ایک درخشندہ نصب العین۔ اور ان کے قلوب میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ ہوتی ہے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے مختلف اسباب و ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں اور اس سفر میں اپنی ترقی کا اظہار مختلف الفاظ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس قوم پہ زندگی کی بجائے رفتہ رفتہ موت چھا جاتی ہے۔ ان کا عروج زوال میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قوتیں ضعف میں اور ولولے پژمردگی میں بدل جاتے ہیں تو جس طرح ان کے اعمال کی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں اور روح مفقود ہو جاتی ہے اسی طرح ان کے الفاظ (یعنی اصطلاحات) تو علیٰ حالہٖ

موجود ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے معانی یکسر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ پھر جس طرح وہ قوم ان بے روح اعمال کی ظاہری شکلوں پر مطمئن ہو جاتی ہے اور حقائق کا سامنا کرنے سے بھی کتراتی ہے۔ اسی طرح ان اصطلاحات کو بلا سوچے سمجھے استعمال کرتی رہتی ہے اور ان کے حقیقی معانی کی طرف کبھی توجہ نہیں دیتی۔ وہ جس طرح اعمال کو ان کے نتائج سے نہیں پرکھتی اسی طرح ان اصطلاحات کو بھی کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہونے دیتی۔ ایسی حالت میں حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان اصطلاحات میں باتیں نہ کی جائیں بلکہ عام الفاظ میں مطلب واضح کیا جائے۔ مثلاً جس زمانہ میں مسلمان ایک زندہ قوم تھے یہی نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ جہاد۔ سحاب ملی کی تڑپتی ہوئی بجلیاں تھیں اور ایمان۔ اعمال۔ عبادات۔ صبر۔ رضا۔ توکل۔ ثواب۔ زندگی ناپنے کے نہایت پیمانے۔ لیکن آج کیا حالت ہے! نماز۔ روزہ وغیرہ اعمال ہیں بلانتیجہ۔ اور ایمان، عبادت وغیرہ الفاظ ہیں بلا معانی۔ مثلاً ہم نے کہا کہ اعمال کو قرآنی کے معیار کے مطابق نتائج سے پرکھنا ضروری ہے۔ جب تک اعمال ایسے نتائج مرتب نہیں کرتے جو قرآن کریم نے متعین کئے اور قرون اولیٰ میں محسوس شکل میں ہمارے سامنے آ گئے اس وقت تک ہمیں کبھی باور نہیں کرنا چاہئے کہ اعمال اپنے حقیقی مفہوم میں ادا ہو رہے ہیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے سے ہمارے جھوٹے اطمینان کی جنت ہم سے چھن جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے نفس نے اپنے لئے ایک اور آڑ تلاش کر لی اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ نہیں! یہ اعمال بلانتیجہ نہیں رہتے۔ ان سے ثواب ملتا ہے! لیکن قرآن کریم کی روشنی میں بھلا ایسی آڑ کی کہاں گنجائش! وہ جہاں احکام و اعمال کے متعلق واضح طور پر بتاتا ہے کہ ان سے کیا نتائج مرتب ہونے مقصود ہیں اسی طرح ان اصطلاحات کے متعلق بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ ان سے حقیقی مفہوم کیا ہے۔

اب دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے ثواب کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح سے ملتا ہے۔

سورۂ آل عمران میں ہے

وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ ۳/۱۴۵

اور (دیکھو) کتنے ہی نبی (ایسے گذرے) ہیں جن کے ساتھ ہوکر اللہ والوں کی جماعت
نے (خدا کی راہ میں) جنگ کی۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان سختیوں کی وجہ سے جو انھیں
اللہ کی راہ میں پیش آئی ہوں وہ بے ہمت ہو گئے ہوں۔ یا (میدان میں جاکر) کمزور
پڑ گئے ہوں یا (دشمن سے مرعوب ہوکر) عجز و بے چارگی کا اظہار کر دیا ہو۔ اور اللہ انہی
لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو (مشکلات و مصائب میں) ثابت قدم رہتے ہیں۔

یہ ایک عمومی حقیقت بیان فرمادی کہ حق و باطل کے معرکہ میں حق پرستوں کی روشِ زندگی کیا ہوا کرتی ہے۔ ان اللہ کے سپاہیوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ہجومِ مصائب اور کثرتِ مشکلات کے وقت وہ قطعاً نہیں گھبراتے نہ ہمت ہارتے ہیں۔ بلکہ

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا
فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ ۳/۱۴۶

اور ان کی زبانوں سے اس کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا کہ خدایا! ہماری کوتاہیوں کو معاف
کردے اور ہمیں ہمارے کام میں جو زیادتیاں ہوگئی ہوں اُن سے درگذر فرما اور ہمارے
قدم جما دے۔ اور منکرین کی قوم پر ہمیں فتحمند کر۔

یہ ان انسانوں کی کیفیت تھی۔ اب ان کے ان اعمال کے بدلے میں اللہ کی طرف سے کیا ملا؛ فرمایا:

فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ ۳/۱۴۶

پس اللہ نے انھیں (دونوں جہان میں) ثواب (اجر) عطا فرمایا۔ دنیا کا ثواب
بھی دیا اور آخرت کا بھی بہتر ثواب دیا۔ اللہ محسنین کو دوست رکھتا ہے۔

یعنی ایمان و اعمال کا لازمی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں میں ثواب ملے۔ آخرت کے ثواب کی جمالی تفاصیل بھی قرآن کریم میں موجود ہیں۔ لیکن دنیا کا ثواب ایک ایسی چیز ہے جس کی تشریح قرآن کریم نے فرمادی ہے اور اسے ہم اچھی طرح سے سمجھ سکتے اور محسوس کر سکتے ہیں۔ حضرات انبیاء کرام

اور ان کی حق پرست جماعتوں نے کس طرح کفر و باطل کے مقابلہ میں مجاہدانہ سعی و عمل سے کام لیا۔ اس کی تابندہ داستانیں قرآن کریم کے اوراق میں محفوظ ہیں اور ان اعمال کا ثواب کس طرح سے ملا۔ اس کی تفصیل بھی ساتھ ہی ساتھ دے دی گئی ہے تاکہ آنے والوں کو معلوم ہو سکے کہ ثواب سے کیا مفہوم ہے۔ ان تمام واقعات کا تفصیلی تذکرہ تو اس مقام پر مشکل ہے۔ البتہ دو چار مقامات پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو ثوابِ دنیا کس شکل میں عطا فرمایا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل کے متعلق فرمایا

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝ ۴/۵۴

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت عنایت فرمائی (اور ان کے ساتھ) عظیم الشان سلطنت بھی عطا فرمائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں فرمایا:۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ

اور اس طرح ہم نے سرزمین (مصر) میں یوسف کو تمکن کر دیا کہ جہاں چاہے اپنے اختیارات کو چلائے۔

حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کی تو تمام داستان ہی اس ثوابِ الدنیا کی تشریح و تفسیر ہے۔ ان کی لمبی چوڑی داستان کا خلاصہ یہ تھا کہ

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۥ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝ ۷/۱۳۷

اور جس قوم کو (فرعون وغیرہ کے استبداد نے) کمزور بنا دیا تھا ہم نے اسی (کمزور) قوم کو اس بابرکت ملک کے مشارق و مغارب کا وارث بنا دیا۔ اور تیرے پروردگار کا فرمانِ پسندیدہ (وعدہ) بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا۔ ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے

اور فرعون اور اس کی قوم کا ساختہ پرداختہ اور ان کی (فلک بوس) عمارات کو ہم نے خاک میں ملادیا۔

بنی اسرائیل کو اس طرح ثواب الدنیا ملا۔ اس کے بعد اس عہدِ ہمایوں کی طرف نگاہ ڈالیے جس کی نظیر چشمِ فلک نے نہ اس سے پیشتر نہ اس کے بعد آج تک دیکھی۔ یعنی عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اللہ کے ان مخلص بندوں نے خدا کی زمین پر خدا کے قوانین نافذ کرنے کے لئے جن جانگسل مراحل کو طے کیا ان کا ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ سعی وعمل کی اس درخشندہ داستان کا خلاصہ (اور نتیجہ) قرآن کریم نے ان جلیل القدر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۚ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝ ۳۳/۲۷

اور ہم نے تمھیں ان (تمھارے مخالفین) کی سرزمین کا، ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا وارث بنادیا اور اس زمین کا بھی جہاں تمھارے پاؤں بھی نہ پہنچے تھے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ حضراتِ انبیاء کرام اور ان کی حق پرست وحق آگاہ جماعتوں کو کس طرح ثواب دیا کرتا ہے۔ اس سے ثواب کا قرآنی مفہوم بآسانی متعین ہوجائے گا۔ اور جب یہ قرآنی مفہوم سامنے آجائے تو پھر سوچئے کہ کیا ہمارے اعمال کا ثواب بھی ہمیں مل رہا ہے۔ قرآنی ثواب کوئی ایسی چیز نہیں جسے محسوس نہ کیا جاسکے۔ جو میزانِ امروزہ میں تولا نہ جاسکے۔ قرآن کریم کی تعلیم تو اس باب میں ایسی واضح اور کھلی ہوئی ہے کہ کوئی شخص اس دھوکے میں نہیں رہ سکتا کہ اس کے اعمال، معیارِ قرآنی پر صحیح اتر رہے ہیں یا نہیں۔ صحیح اعمال کا ثواب تو لہلہاتی کھیتی کی طرح سامنے آجاتا ہے:۔

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ
يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۝ ۴۸/۲۹

اس کھیتی کی طرح جو (سب سے پہلے) اپنی سوئی باہر نکالتی ہے۔ پھر (اس کمزور سی سوئی میں) طاقت پیدا ہوتی ہے پھر وہ سوئی بوٹی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ (ایک مضبوط) تنا بن کر اپنی جڑ پر کھڑی ہو جاتی ہے جس سے کسان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور کفار اس سے غصہ میں پیچ وتاب کھاتے ہیں۔

یہ ہے ثواب کا صحیح مفہوم۔ لیکن جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے جس قوم پر جمود وتعطل کا عذاب چھا جائے وہ ثواب کے لئے نہایت سہل راستے وضع کر لیتی ہے۔ کہیں پانی پلانے کے لئے "سبیل" لگا دی۔ دو چار دیگیں پکا کر نیاز بانٹ دی۔ جمعرات کی شام بھک منگوں میں چنے یا دھیلے تقسیم کر دیئے وغیر ذالک۔ اور اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے کہ اللہ کے فضل سے بہت ثواب کما لیا ہے! لیکن ثواب وجنت کی راہیں ہماری آرزوؤں کے مطابق کشادہ نہیں ہوتیں (لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ) ان کے لئے تو قرآن کریم نے واضح اور استوار معیار مقرر فرما دیئے ہیں۔ وہ قرآن کریم جس کا ارشاد ہے کہ

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُونَ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ ۹/۱۸

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیل لگا دینا یا مسجد الحرام کو آباد رکھنا اس شخص (کے اعمال) کی مانند ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا؟ (تمہارے خود ساختہ معیاروں کے مطابق یہ دونوں برابر ہوں تو ہوں) اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں۔ اللہ ظلم کرنے والوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا

اب پھر سورۂ آل عمران کی ان آیات کو سامنے لائیے جن سے آغازِ سخن ہوا تھا۔ دیکھئے کہ وہاں ثوابُ الدّنیا والآخرہ کے لئے جہاد ہی شرط رکھی ہے۔ مومن کا ہر عمل جو قرآنی نظام کے ماتحت سرزد ہوتا ہے اس عظیم المرتبت سلسلہ کی کڑی ہوتا ہے اور وہ اپنے جیتے جاگتے اعمال سے ہر وقت اس "کارِ ثواب" کیلئے

ہمہ تن مستعد رہتا ہے۔ ادھر سے یہ ثواب کے کام عملی پیکر میں مشہود ہوتے ہیں اور ادھر سے کامرانی و شادمانی خدائی رحمتوں کے ساتھ جلوہ بار ہوتی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ
اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ ۹/۲۰

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں سے جہاد کیا۔ (ان کے لئے) اللہ کے ہاں بہت بڑے مدارج ہیں۔ اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

یہی لوگ ہیں جو سچے معنوں میں فائز المرام و کامیاب و کامران قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ دنیا میں جاہ و حشمت اور حکومت و سلطنت کی زندگی اور آخرت میں سرخروئی و سرفرازی کی جنت۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

---

(۲)

اواخر اکتوبر کا قابلِ ذکر واقعہ مسلم لیگ کی جماعت کا ایوانِ مجلس آئین ساز (اسمبلی) سے "واک اوٹ" ہے جب لیگ کے حلقہ میں اس فیصلہ کی افواہ گرم تھی تو اطراف و جوانب سے طرح طرح کے خدشات کی بھنک کانوں میں پڑتی تھی۔ اسمبلی کی لیگ پارٹی جن مختلف التنوع عناصر سے مرتب ہے ہمیں اس کا علم ہے۔ اسی علم کے پیش نظر ہمارا خود دل دھڑکتا تھا کہ کہیں کسی کے ذاتی مفاد اور قلبی و ذہنی امیال و عواطف اسے آمادۂ انتشار و سرکشی نہ کر دیں۔ لیکن اس فیصلہ کو عمل میں لانے کے لئے ارکانِ جماعت نے جس ہمرنگی و ہم آہنگی کا ثبوت دیا ہے اس نے ہماری امیدوں کو ایک حیاتِ نو عطا کر دی ہے۔ ہر چند اس تمام کامیابی کا سہرا جناب جناح کے سر ہے جنھوں نے اس قدر متضاد عناصر میں اس قدر یگانگت و اتحادِ عمل پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اراکینِ جماعت نے جس اطاعت شعاری اور جذبۂ ایثار کا ثبوت دیا ہے اس کے لئے ہم ان کی خدمت میں نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ تمام ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی طرف سے دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ وہ یقین مانیں کہ انھوں نے اپنے اس حسنِ عمل سے قوم کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ حقیقی عزت اسی طرح سے حاصل ہوا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزم میں استقلال اور جذبۂ اطاعت و ایثار میں استقامت عطا فرمائے۔ اگر انھوں نے ہر موقعہ پر اسی قسم کے ضبط و انضباط اور اطاعت و ایثار کا ثبوت دیا تو وہ دن دور نہیں کہ ہماری نکبت و زبون حالی

پھر سے سرفرازی و سربلندی میں تبدیل ہو جائے گی اور ہم ساری دنیا کو بتا سکیں گے کہ
نشاں یہی ہیں زمانے میں زندہ قوموں کے

اسمبلی سے "واک آوٹ" کا واقعہ یوں تو ایک معمولی سی چیز ہے اور بعض حلقوں میں یہ کہکر بھی خوش ہو لیا جائے گا کہ یہ کانگرس کی تقلید ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک نہ واقعہ ایک معمولی واقعہ ہے اور نہ ہی کسی کی تقلید ہے۔ مومن کی زندگی اپنے رجحانات کے ماتحت نہیں بسر ہوتی بلکہ اس کا ہر قدم ایک اصول کے ماتحت اٹھتا ہے۔ وہ اگر کہیں جاتا ہے تو اس اصول کے استحکام کی خاطر اور اگر وہاں سے نکلتا ہے تو اس اصول کی خاطر۔ اسے تو دعا ہی یہ سکھائی گئی ہے کہ

وَقُل رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي
مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا ۝ ۱۷/۸۰

اور کہہ میرے پروردگار! مجھے (جہاں کہیں پہنچا) تو صداقت سے پہنچا۔ اور (جہاں کہیں سے نکال) تو سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے ہاں سے قوت عطا فرما۔ ایسی قوت کہ (ہر حال میں) مددگاری کرنے والی ہو۔

وہ کہیں داخل ہوتا ہے تو صداقت لئے ہوئے اور وہاں سے "واک آوٹ" کرتا ہے تو صداقت کے لئے۔ نہ اس کا جانا اپنی مرضی کے ماتحت نہ وہاں سے آنا اپنی خواہش کے تابع۔

اور پھر ایک مردِ مومن کا کہیں سے روٹھ کر چلے آنا کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ جہاں سے وہ یہ کہکر چلا آئے لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (جاؤ! مجھے تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ تمہارا نظامِ حیات تمہارے لئے۔ میرا ضابطۂ قانون میرے لئے) تو ڈریئے اس بستی کے انجام سے! خوف کھایئے ان کے مآل سے۔ اس کا وہاں سے نکل جانا اس امر کی زندہ دلیل ہے کہ وہ مقام اب عذابِ خداوندی کا مہبط بننے والا ہے۔ وہ نکلتا ہی اس وقت ہے جب دیکھ لیتا ہے کہ اس کی ہلاکت مقدر اور ان پر خدا کے قانون کی گرفت مسلط ہو چکی ہے۔ وہ جن سے روٹھتا ہے ان سے ان کا خدا روٹھ جاتا ہے اور جب کسی سے اس کا خدا روٹھ جائے تو کون ہے جو اسے

پناہ دے سکے۔

اور اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک مردِ مومن جب حق و صداقت کی خاطر کہیں سے نکل جاتا ہے تو اس کا نکلنا درحقیقت فاتح و منصور واپس آنے کا اعلان ہوتا ہے۔ وہ نکلتا ہے تو بدر و حنین کی تیاریوں کے بعد خدا کے اس وعدے کو سچا کرنے کے لیے کہ

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ ۝ ۴۸/۲۷

تم انشاء اللہ یقیناً اس مسجد الحرام میں (جہاں سے نکل کر تم ادھر آ گئے تھے) امن و امان کے ساتھ پھر سے داخل ہوگے۔

وہ نکلتا ہے تو پھر خدا کے فضل و کرم کے ساتھ بہ ہزار شکوہ و شوکت واپس بھی آتا ہے:

سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝

یہ خدائی قانون ہے جو پہلے سے نافذ و جاری ہے اور خدائی قانون ہرگز تبدیل نہیں ہوتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ آج ہماری جماعتوں کے ایسے اقدام بالعموم اس روح کو ساتھ لئے ہوئے نہیں ہوتے جس کی جھلک اوپر کی سطور میں نظر آ رہی ہے۔ لیکن اگر لیگ کا یہ اقدام ذاتی مفاد پر مبنی نہیں بلکہ حق و صداقت پر مبنی ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کی نصرت ان کے ساتھ ہوگی۔ اور اگر انھوں نے اس اقدام کے بعد سہل انگاری سے نہیں بلکہ مستعدی اور تن دہی سے کام لیا تو وہ دن بھی دور نہیں رہ سکتا جب اللہ تعالیٰ ان کے اپنے اعمالِ حیات میں حقیقی روح بھی پھونک دے گا۔ کہ اگر اس کی راہ میں ایک قدم بھی صحیح اٹھایا جائے تو وہ دس قدم اٹھانے کی طاقت عطا فرما دیا کرتا ہے۔

خدا کرے کہ ہماری ان رسمیات میں حقیقی روح جلوہ بار ہو جائے۔ اللہ کی رحمت سے ایسا ہونا کیا بعید ہے۔ باقی رہے ہمارے وہ بھائی جنھوں نے اپنی جماعت کے اس متفقہ فیصلہ کے بعد اس کی خلاف ورزی کی اور اکیلے اسمبلی میں چلے گئے تو ان کا ذکر ہی بے کار ہے۔ دنیا میں جب کسی کو نیک نامی سے شہرت حاصل نہیں ہوتی تو وہ ان طریقوں سے اپنا تعارف کرا لیتا ہے۔ کیا اس سے پیشتر آپ نے کبھی جناب غیاث الدین صاحب کا نام بھی سنا تھا۔

(۳)

ہمارے "نادان دوست" جناب فضل الحق صاحب کی وحشت سامانیاں ہر درجہ اضطراب و باعثِ تشویش ہو رہی تھیں۔ لیکن للہ الحمد کہ تیمار داروں کے حسنِ تدبیر اور قوتِ برداشت نے مریض کو سنبھال لیا۔ اور اللہ نے اُس کے چاکِ گریباں کی آبرو رکھ لی ورنہ ایسے امراض کے دَورے خطرناک ہوا کرتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ واقعہ ان کے ذوقِ جنون کے لئے کافی عبرت کا موجب ہوگا۔

بہرکیف مریض اور تیمار دار دونوں مستحقِ مبارکباد ہیں۔

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگِ محتسب

بر دلِ ما آمد و این آفت از مینا گذشت

جناب جناح "ملتِ اسلامیہ" کی طرف سے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہایت کشادہ ظرفی اور بلند نگہی سے کام لیتے ہوئے ملّت کے مفاد کو اپنے ذاتی جذبات پر ترجیح دی۔ ان کی عظمت اسی میں تھی۔ نیز شکریہ کے مستحق ہیں وہ تمام حضرات جنھوں نے اپنی سعی و کاوش سے اس گتھی کو سلجھانے میں مدد دی۔ اور شکریہ کے مستحق ہیں جناب فضل الحق صاحب جنھوں نے دشمنانِ ملّت کو مزید ہنسی اور شادمانی کا موقعہ نہ دیا۔

---

(۴)

امریکہ کے ایک دریدہ دہن اخبار نے حضور ختمی مرتبت سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کی ذاتِ اقدس واعظم کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ جس کے خلاف سر عبدالحلیم صاحب غزنوی نے اسمبلی میں التوا کی تحریک پیش کی۔ ہم جناب غزنوی کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اس صدائے احتجاج سے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی۔ لیکن افسوس ہے کہ حکومت نے مسئلے کی اہمیت کا کماحقہٗ احساس نہیں کیا۔ دنیا کو شاید ابھی معلوم نہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک جس کے دل میں ایمان کی کوئی کرن بھی موجود ہے۔ حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کیا ہے! وہ ذاتِ گرامی (فداہ ابی و اُمّی) جن پر ایمان ہمارے لئے باعثِ نجات و سعادت اور جن کی محبت سرمایۂ زندگی و متاعِ حیات ہے۔ ہمارے نزدیک معراجِ انسانیت کا مظہرِ اتم اور دنیا و آخرت کی بلند ترین سرفرازیوں کا پیکرِ مقدس ہے۔ اس ذاتِ فخرِ موجودات کی شان میں نازیبا الفاظ تو کجا ہم تو ان کو چوں اور

گلیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کرسکتے جن کے ذرات کو اس پیکر رفعت وعظمت کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہوگئی۔ خوش بخت وہ راہیں جن میں وہ شمع فروزاں ضیا بار و جلوہ ریز ہوئی۔ اور زہے نصیب خاک کے ان ذروں کے جو ان درخشندہ و تابناک نقوش قدم کے چومنے سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ دنیا کیا جانے کہ اس پیکر محبوبیت کے ساتھ ہمارے قلوب کا کیا رشتہ ہے! ایک زندگی کیا! ہزار بار زندگی نصیب ہو اور ہزار بار اس شاہنشاہِ کونین کی ناموس پر نچھاور ہو جائے تو بھی دل کی تمنا بر نہ آئے۔ جس سینے میں عشقِ رسولؐ کا سوز نہیں۔ سینہ نہیں۔ یہ بختیوں اور تاریکیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموسِ محمدؐ پر مرشنے کی تمنا نہیں۔ دل نہیں۔ بوم و کرگس کا وحشت انگیز کاشانہ ہے۔ لیکن! غلام کا عشق کیا اور محکوم کی تمنا کیسی! تحفظ ناموسِ رسولؐ تدائری کے احتجاجات سے نہیں ہوسکتا جماعت کی قوت سے ہوسکتا ہے۔ وہ ذلت جس کے ضعف کا باعث خود جناب عبدالحلیم صاحب غزنوی بنے! ہم اپنے اس بھائی سے ناموسِ رسالتؐ کے نام پر اپیل کریں گے کہ وہ اپنی انفرادی روش کو چھوڑ کر پھر سے جماعت میں آملیں۔ اور یوں ریت کے بکھرے ہوئے ذروں کو ایک ایسی محکم چٹان بنادیں کہ مخالفت و نامساعدت کی جو موج اس سے ٹکرائے پاش پاش ہو جائے۔ اس وقت ہم دیکھیں گے کہ کس میں یہ ہمت پڑتی ہے کہ وہ شاہنشاہِ کونین (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تو کجا اُن کے کسی ادنیٰ غلام کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھ جائے!

افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ

اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

معارف القرآن کے متعلق سابقہ اشاعت میں شمس العلماء حبیب الحق صاحب مدظلہٗ کا ایک گرامی نامہ شائع کیا گیا تھا۔ اس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ کتاب کو ابھی استیعاباً نہیں دیکھا۔ کتاب کو استیعاباً دیکھنے کے بعد اُن کا ایک تفصیلی مکتوبِ گرامی موصول ہوگیا۔ جسے اشاعتِ حاضرہ میں شائع کرنے کا فخر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرمالیجیے کہ معارف القرآن کیا ہے!

بے حِسی

[اس دفعہ کئی برس کے بعد ماہ رمضان کے کچھ دن ملتان میں گذارنے کا موقع ملا مسلمانوں کے اس تاریخی شہر میں خاص طور پر ایّامِ صیام میں کم از کم صوم و صلوٰۃ ہی کی حد تک جو سرگرمی پائی جاتی تھی اس دفعہ اس میں نمایاں کمی نظر آئی۔ ذیل کے اشعار ان احساسات کا نتیجہ ہیں جو یہ صورتِ حال دیکھ کر دل میں پیدا ہوئے۔ اسد]

سوز و گدازِ قلبِ مسلماں کو کیا ہوا
مومن کے ذوق و شوقِ فراواں کو کیا ہوا

وہ عشق و آرزو کی حرارت کہاں گئی
جوششِ حیات و جذبۂ ایماں کو کیا ہوا

چھائی ہوئی جو بے دلی اور مُردنی سی ہے
زندوں کا دل کدھر گیا اور جاں کو کیا ہوا

بندوں نے کس سبب سے خدا کو بھلا دیا
روزِ ازل کے وعدہ و پیماں کو کیا ہوا

پابندیٔ نماز نہ روزوں کا احترام
آئینِ مصطفےٰ کے نگہباں کو کیا ہوا

آتی جو نغمۂ سحری کی صدا نہیں
باغِ نبی کے مرغِ خوش الحاں کو کیا ہوا

کیوں آج لوگ دین سے غافل ہیں اس قدر
زورِ بیانِ عالمِ قرآں کو کیا ہوا

سینے ہیں سامعین کے سرد و سیاہ کیوں
واعظ کے نطقِ شعلہ بداماں کو کیا ہوا

گر پیرِ خانقہ کی کرامات ہے نہاں
شیخِ حرم کے زہدِ نمایاں کو کیا ہوا

کیا یہ بھی حبِّ جاہ کے رستے میں لٹ گئی
صاحب دلوں کی دولتِ عرفاں کو کیا ہوا

سینے میں بند رہ کے وہ بجھ ہی گئی نہ ہو
صوفی کے دل کی شمعِ فروزاں کو کیا ہوا

مانا امیر نشۂ دولت میں مست ہیں
لیکن فقیرِ بے سر و ساماں کو کیا ہوا

یوں خشک ہو رہی ہیں دلوں کی جو کھیتیاں
اہلِ نظر کے دیدۂ گریاں کو کیا ہوا

اہلِ خرد کی روشنیٔ علم کیا ہوئی
اہلِ جنوں کے چاکِ گریباں کو کیا ہوا

ویراں رہیں مہِ رمضاں میں بھی مسجدیں !
حیراں ہوں اے اسد مرے ملتاں کو کیا ہوا

اسد ملتانی

بینک روڈ۔ پٹنہ
یکم نومبر ۶۸ [illegible]

مکرم و مخلص — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نے معارف القرآن بالاستیعاب پڑھی۔ سبحان اللہ کیا کتاب لکھی گئی ہے۔ مخلص جن مباحث میں
میں کہیں اختلاف ہوا ہے تو فطرت انسانی سے جو ناقابل تجدید ہے۔ اس کتاب میں چند خصوصیتیں ہیں
ایک تو یہ کہ سارے خیالات و اختلافات کو پیچھے پھینک کر خدا اور خدا کا صراط مستقیم نصب العین
نصب العین رکھا ہے۔ میں کیا خدا اسے قبول کرے مقبول کرے اور قوم کی نسبت ایسے سب کو مجبور
دراس کتاب کا نصب العین ہے۔ دوسرے اختلافات و نزاعات باہمی میں جو قرآن کے معانی بدل دیے ہیں
خطاب علیہم الرحمن فقست قلوبہم کے اصول پر معانی قرآن کو صرف بند دیا گیا ہے اور اسکی
اصلاح ہوگئی ہے۔ تیسری ضرورت اور پوری ہونے کی امید ہے کہ قرآن کا صحیح ترجمہ جسکی ضرورت
ہر کسی کو استعداد درکار ہے وہ انشاء اللہ پوری ہو جائیگی مگر افسوس یہ ضرور ہے کہ یہ ضرورت
ان جلدوں میں پوری نہ ہوگی۔ اسلئے اگر آپکو ساری جلدوں کی تصنیف سے فرصت ہو گئی ہو تو
مناسب ہے کہ ساری کتاب جو ابھی غیر مطبوعہ ہے اور جس میں قرآنی الفاظ کے معانی کی بحث کرکے
قرآن کا ترجمہ شائع کیا جائے جو سب ترجموں پر حاکم ہو اور جسکی تبلیغ آسانی اور عام ہو سکے اور اس
تعلیم کا دروازہ جسکے مقبول اور مطلع ہونے کی فضا خود آپ نے پیدا کردی ہے۔
خدا سے امید ہے کہ آپ سب کو اجر دیں۔ میں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ زندہ ہوں
ہم نے شرہ لگی [illegible] حال نہ ہوگا جب تک دلوں میں روحانیت اور پاک باطنی نہ آئیگی اور
یہ بغیر خدا کی خالص محبت کے حاصل نہیں ہونگی۔ ضرورت اور یہ توجہ کرنیکی بھی ہے اسکی
ضرورت یہی ہے کہ تفہیم قرآن کی تلاوت معانی و مقصد کے ساتھ کرنیکی تبلیغ کی جائے زبانی بھی عملی بھی
تبلیغ کی طرح بلکہ [illegible] میں بیٹھکر چند گھڑی میں [illegible] محنت کرنا [illegible]
[illegible] رکھا ہے — والسلام

مضمون مکتوب گرامی جناب شمس العلماء حافظ سید محب الحق صاحب مدظلہٗ

بینک روڈ پٹنہ

یکم نومبر ۱۹۴۱ء

مکرمی و مخلص ـــــ سلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

میں نے معارف القرآن بالاستیعاب پڑھا سبحان اللہ کیا کتاب لکھی گئی ہے۔ محض جزئیات میں کہیں کہیں اختلاف ہونا یہ تو فطرت انسانی ہے جو نا قابل توجہ ہے۔ اس کتاب میں چند خصوصیتیں ہیں ایک تو یہ کہ سارے خیالات و اختلافات کو پیٹھ پیچھے پھینک کر خدا اور خدا کی صراط مستقیم نصب العین رہی ہے۔ میں کیا خدا اوسے قبول کرے مقبول کرے اور قوم کی نسبت اپنے ساتھ جوڑ دے جو اس کتاب کا نصب العین ہے۔ دوسرے اختلافات و نزاعات باہمی نے جو قرآن کے معنی بدل دئے ہیں جو فطال علیہم الامد فقست قلوبھم کے اصول پر معانی قرآن محرف بنا دیا گیا ہے اسکی اصلاح ہوگئی ہے تیسری ضرورت اور پوری ہونے کی امید ہے کہ قرآن کا صحیح ترجمہ جس کی ضرورت قوم کو شدید اور اشد ہے وہ انشاء اللہ پوری ہو جائے گی مگر افسوس یہ ضرور ہے کہ یہ ضرورت کئی جلدوں میں پوری ہوگی اس لئے اگر آپ کو ساری جلدوں کی تصنیف سے فرصت ہو گئی ہو تو اس کا موقع ہے کہ ساری کتاب جو ابھی غیر مطبوعہ ہے اس سے قرآنی الفاظ کے معانی کی صحت کر کے قرآن کا ترجمہ شائع کیا جائے جو سارے ترجموں پر حکم ہو اور جس کی تبلیغ آسان اور عام ہو سکے اور اس انقلابی دور میں جس کے مقبول اور مصلح ہونے کی فضا خدا نے پیدا کر دی ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ آپ مع الخیر ہوں۔ میں بھی اب تک جوں توں زندہ ہوں۔

قوم نہ بدلے گی اس کا حال نہ بدلیگا جب تک اس میں روحانیت اور پاک باطنی نہ آئے گی اور یہ بغیر خدا کی خالص محبت کے حاصل نہیں ہونیکی ضرورت ادہر توجہ کرنے کی بھی ہے اس کی صورت یہی ہے کہ قوم کو قرآن کی تلاوت معانی و مفہوم کے ساتھ کرنے کی تبلیغ کی جائے زبانی بھی عملی بھی اسٹیج سے نہیں بلکہ مسجدوں میں بیٹھکر چند لوگوں میں بطور مشورت پیش کرنے کا رنگ اختیار کیا جائے افسوس کہ اس کے لائق میں اب نہیں رہا۔

سید محب الحق

طرحِ نو

اس نظم کی تقریب کے لئے پہلے "حقائق و عبر" کا ذیلی عنوان "بیکاروں کے شغلے" بر صفحہ ۳۸ ملاحظہ فرمائیے۔ (طلوعِ اسلام)

تجھے اے بلبلِ رنگیں نوا سوجھی ہے گانے کی
مگر مجھکو پڑی ہے فکر تیرے آشیانے کی

یہ تیرے آڑے ترچھے چار تنکے شاخِ گلبن پر
کبھی سے بجلیاں ہیں فکر میں ان کے جلانے کی

یہ گلچیں۔ باغباں۔ صیاد۔ یہ تیرے کرم فرما
لئے بیٹھے ہیں دل میں حسرتیں تجھکو مٹانے کی

سنبھالے اپنے پر پرزے ترے سب ہمصفیروں نے
ہر اک نے فکر کی ہے اپنے اپنے آشیانے کی

مگر اک تو ہی غافل ہے مآلِ کارِ گلشن سے
ترے حصے میں آئیں غفلتیں سارے زمانے کی

کبھی سوجھا ہے بھی ہے تجھکو کہ اب رنگِ چمن کیا ہے؟
کبھی سوچا بھی ہے تو نے ہوا کیا ہے زمانے کی!

نہ پھولوں کے وہ تیور ہیں نہ غنچوں کی وہ چتون ہے
خدا جانے کدھر کو اب کشش ہے آب و دانے کی

پرانے برگ و گل سب چھانٹے جائینگے خیاباں سے
لگی ہے باغباں کو دھن نیا گلشن بنانے کی

نئے پودے۔ نئے بوٹے۔ نئے گلبن۔ نئے تختے
نئی شرطیں بنیں گی اب چمن میں آنے جانے کی

قفس بھی۔ دام بھی۔ مقراض بھی بالکل نئے ہونگے
نئی ترکیب ہوگی تجھکو پھندے میں پھنسانے کی

یہ الجھن ہے تو تجھ سے باغ اب چھوٹے کا چھوٹا ہے
بنیں گی سازِ عبرت حسرتیں تیرے فسانے کی

اگر گلشن میں رہنا ہے بدل لے تو بھی ڈھنگ اپنا
سماعت اب نہیں ہوگی کسی حیلے بہانے کی

نہ بایستے ترا در باغ سازِ آشیاں کردن
چو کردی زندگی باید بحکمِ باغباں کردن

(نیرنگ)

"حقائق و عبر"

بے کاروں کے مشغلے

آج دُنیا میں جو ہنگامۂ رستخیز برپا ہے وہ ہر دیکھنے والی آنکھ اور ہر دھڑکنے والے دل کے لئے قیامتِ صُغریٰ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ دُنیا کا خطہ خطہ انقلاب کی آماجگاہ بن رہا ہے۔ تخت اُلٹ رہے ہیں۔ تاج چھن رہے ہیں۔ بستیاں اجڑ رہی ہیں۔ ستائیں لُٹ رہی ہیں۔ باپ کو بیٹے کا علم نہیں۔ بیٹی کو ماں کی خبر نہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ اس پر کل کیا گذرنے والی ہے۔ انسانوں کا لہو سمندر کے کھاری پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو رہا ہے۔ ہر قوم اپنے مستقبل کے متعلق لرزاں و ترساں ہے۔ ہر جماعت اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے ہمہ تن تشویش و کاوش ہے۔ لیکن اس تمام ہنگامۂ ہاؤ ہو میں۔ اس جہانِ سعی وعمل میں بے فکروں کی ایک ایسی جماعت بھی ہے جسے اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی کچھ فکر نہیں کہ کل خود ان پر کیا گذرنے والی ہے۔ وہ اپنے خوابوں کی دنیا میں مست۔ کہکشاں کی جوئے مرمریں میں اپنی "معصوم تمناؤں" کی کشتیِ سیمیں کھیتے۔ تاروں کی چھاؤں میں۔ دور۔ اُفق کے اُس پار۔ آکاش کے کسی حسین طلسماتی مندر کی طرف جانے کی فکر میں غرق ہیں۔ جہاں ان کی زندگی کا مُدعا۔ لیکن دشمنِ جان۔ منجمد فشردہ یاسمین کا بلوریں مجسمہ۔ رعنائیوں اور شادابیوں کی ہزار جنتیں جلو میں لئے۔ مینا بردوش اور خنجر بکف۔ محوِ خرام ناز ہے۔ یہ ہے ہمارے شاعروں کی جماعت۔ جنھیں نہ فکرِ فردا ہے نہ غمِ دوش۔ ان کے ساتھ ساتھ بے فکروں کا ایک اور گروہ ہے جسے سخن شناس و سخن فہم حضرات کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کرائی جائے جس میں ان تمام کھوئے ہوئے انسانوں کو جمع کیا جائے اور جھوٹی واہ واہ سے ان کے فریبِ نفس کو ایسا پختہ تر کیا جائے کہ وہ حقائق کی دُنیا کی طرف کبھی آہی نہ سکیں۔ فریبِ نفس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہے کہ ہر شاعر جب کسی دوسرے کو داد دیتا ہے تو جی میں

خوب سمجھتا ہے کہ میں اسے بنا رہا ہوں۔ لیکن جب خود شعر سنانے اٹھتا ہے تو دوسروں کی تحسین و آفرین کو بالکل سچی داد سمجھتا ہے اور جھک جھک کر سلام کرتا ہے۔ مسلمانوں کی بالعموم یہ حالت ہے کہ جب کبھی انھیں ملت کے اجتماعی مفاد کے کسی کام میں شرکت کے لئے کہا جائے تو ہر شخص اپنی عدیم الفرصتی کا رونا روئے گا۔ لیکن بزمِ مشاعرہ ہر روز منعقد کیجئے کیا مجال جو کسی کی عدیم الفرصتی شرکت یا انتظام میں مانع ہو جائے۔ پچھلے دنوں اسی قسم کا ایک اجتماع دارالسلطنت دہلی میں بھی منعقد ہوا۔ اس کی جو روئداد ہم تک پہنچی اس سے معلوم ہوا کہ عام سننے والوں کی طرف سے اچھی خاصی بدتمیزی کے مظاہرے ہوئے جو ہماری سوسائیٹی کے آدابِ معاشرت اور نوجوانوں کے ضبط و انضباط کے نہایت عمدہ آئینے تھے۔ باقی رہے شعراء حضرات۔ سو وہ اسی افسانوی دُنیا کے تذکروں میں مست تھے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ہم اِن فرضی عشاق کے فرضی قصہ ہائے ہجر و وصال کی داستانیں ریڈیو پر سُن رہے تھے اور رہ رہ کر جی میں اُبال اٹھتا تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ تو ایسا اٹھے جو اِن بھلے آدمیوں کو بتائے کہ خدارا! سوچو تو سہی کہ دنیا میں آج کیا ہو رہا ہے اور تم کیا کر رہے ہو؟

بارے الحمد کہ ہماری خلش ناکام نہ رہی۔ آخری وقت میں ہمارے محترم جناب میر غلام بھیک صاحب نیرنگ آٹھے اور انھوں نے ایک برجستہ نظم میں وہ سب کچھ کہدیا جو ہمارے جی میں تھا۔ جناب نیرنگ کی یہ نظم دوسرے مقام پر زینت دہ رسالہ ہے۔ ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت و تبریک پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے فضا کے ہنگامی طوفان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بڑی جرأت سے حق کی آواز کو بلند کیا۔ اور کہنے کی بات بڑے سلیقے اور ٹھکانے سے کہدی۔ اس نظم کا کچھ ایسا اثر تھا کہ ہمارا خیال تھا کہ جونہی میر صاحب بیٹھے اعلان کر دیا جائے گا کہ ہمیں اپنی مہمل روش کا احساس ہوگیا ہے۔ ہم جناب میر صاحب کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ہمارے سامنے حقیقت کو بے نقاب کر کے ہمیں خواب سے جگا دیا۔ اب مشاعرہ ختم کیا جاتا ہے۔ لیکن ہوا کیا؟ میر صاحب کو خوب خوب داد ملی۔ اور جب وہ بیٹھے تو ان کے بعد پھر وہی صحرا نوردی اور دشت پیمائی کے افسانے شروع ہو گئے۔ اور پھر اسی قسم کی داد ملنے لگی — توبہ۔ توبہ! ایسی دلچسپ قوم بھی دنیا میں کہیں اور نہ ہوگی یعنی جس نے

اس روش کی مذمت کی اسے بھی جی بھر کر داد دی گئی اور جنھوں نے اس کے بعد اسے پھر شروع کر دیا انھیں بھی دل کھول کر سراہا گیا۔ ان کے نزدیک زندگی اور اس کے مسائل سب شاعری ہی شاعری ہے۔ یوں ہو گیا تو کیا اور وُوں ہو گیا تو کیا۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی۔ نغمۂ شادی نہ سہی

بھلا اس قوم کے پنپنے کی بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟

---

(۲) **مخالفت** مسٹر منشی نے گاندھی جی کی اشیر باد (دعاؤں) کے ساتھ اپنی زندگی کا نصب العین پاکستان کی مخالفت قرار دے رکھا ہے! ہمیں اس سے کچھ تعرض نہیں۔

ہر نور می فشاند و سگ بانگ می دہد

لیکن حیرت و تاسف اس پر ہے کہ ابھی تک اس ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلام کے اس قدر کھلے دشمنوں کے دست و بازو بنتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ "سیاسی نظریوں" کا اختلاف ہے اس لئے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس شخص کی تائید کرے جو اس سے سیاسی نظریہ میں ہمرنگ ہو۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ یہ سیاسی نظریوں کا اختلاف نہیں بلکہ کفر و اسلام کا کھلا ہوا معرکہ ہے۔ پچھلے دنوں لدھیانہ (پنجاب) میں "اکھنڈ ہندوستان" کی کانفرنس میں مسٹر منشی نے اپنے خطبۂ صدارت میں نہایت واضح الفاظ میں بتایا کہ ہندوؤں کو پاکستان کی مخالفت کیوں کرنی چاہئے۔ انھوں نے کہا انھیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے۔ نظریۂ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ:۔

"(۱) تمام ہندوستان کے مسلمان ایک ملتِ واحدہ اور (ہندوؤں سے) الگ قوم ہیں۔

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے اماکن و مساکن (Homelands) بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور

جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے۔

مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر سہروردی نے کہا کہ "ہم ملتِ اسلامیہ کے لئے ہندوستان میں ایسے خطے چاہتے ہیں جہاں ہم دُنیا کا نقشہ اپنے مذہب کے خطوط پر متشکل کر سکیں"

اس کے بعد مسٹر منشی نے بتایا کہ "قرآنی حکومت" میں غیر مسلموں کا کیا حشر ہوگا۔ اور اس کا مہیب اور بھیانک نقشہ کھینچنے کے بعد اپنے مخاطبین سے کہا کہ

"ایک قوم (یعنی ہندو) خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو وہ کبھی اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے افراد شمشیر و سنان کا نشانہ بنائے جائیں۔ ان کی عورتوں کی عصمت ریزی کی جائے اور ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہو"

یہ تو تھا پاکستان کے متعلق۔ اس کے بعد فرمایا۔ کہ

"تم جانتے ہو کہ "اکھنڈ ہندوستان" کے سامنے کیا مقصد ہے؟ اس کا مقصد! وہ عظیم الشان کلچر جسے ہندی کلچر کہا جاتا ہے۔ وہ کلچر جو زمانہ قبل از تاریخ میں پیدا ہوا۔ چھ ہزار برس کی مدتِ مدید میں بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا زمانہ کی سطح کو یوں روندتا مسلتا آگے بڑھتا گیا جس طرح مادرِ گنگا طوفان کے وقت امنڈتی چلی جا رہی ہو۔ ہاں اس کا مقصد؟ نوعِ انسانی کو نجات کا پیغام دینا ہے۔ کیسا پیغام! موت کے مقابلہ میں زندگی کا پیغام۔ سفلی خواہشات پر نصب العین کے غلبہ کا پیغام۔ "جنگل کے قانون" پر (جس کی دنیا پرستش کرتی ہے) اخلاقی نظام کی فتح کا پیغام۔ انسان کو مظہرِ الوہیت بنانے کا پیغام۔ میں جانتا ہوں کہ یہ پیغام ناقابلِ فنا ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ "اکھنڈ ہندوستان" جو اس پیغام کا ایک زندہ پیکر ہے نہ فنا ہو سکتا ہے نہ فنا ہوگا"

(ٹریبون ۲/۱۱/۴۴)

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ مسٹر منشی کس چیز کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ان کے ارشادات کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) مسلمان پاکستان چاہتے ہیں۔

(۲) پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ ان علاقوں میں قرآنی حکومت قائم کی جائے۔

(۳) قرآنی حکومت (معاذ اللہ) وحشت و بربریت کی حکومت ہے۔

(۴) اس کے برعکس "اکھنڈ ہندوستان" کا نصب العین اس کلچر کا احیاء و استبقاء ہے جو چھ ہزار سال سے بھارت ماتا کی گودیوں میں پلا۔ اور "جو جنگل کے قانون" کے مقابلہ میں تہذیب و شائستگی کا پیغام ہے۔

ان تصریحات کے بعد انھوں نے فرمایا:-

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ قومیت پرست مسلمانوں نے مسلم عوام تک پہنچ کر انھیں اس نظریۂ افتراق (پاکستان) کے خطرات سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟" (ایضاً)

آپ کو معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوا! قومیت پرست مسلمانوں کے ایک "مقتدر روحانی پیشوا" (بقول مسٹر منشی) جمعیت العلماء کے رکن حضرت مفتی محمد نعیم صاحب جلسہ میں تشریف فرما تھے۔ یہ "دعوتِ حق" سن کر بے قرار ہو گئے اور بے تابانہ پکار اٹھے لبیک۔ یا جبل لبیک! گھبرائیے نہیں! پاکستان کی ہم مخالفت کرینگے۔ یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے (ہندوستان ٹائمز ۸ ۵/۴۴) آپ نے غور فرمایا کہ جناب مفتی صاحب (اور دیگر قومیت پرست مسلمان اور جمعیت العلماء) کس چیز کی مخالفت پر سر بکف میدانِ جہاد میں اتر رہے ہیں۔ ہندوستان میں مسلم اکثریت کے علاقوں میں قرآنی حکومت کے قیام کے خلاف۔

اے محمدؐ! گر قیامت را برآری سر زخاک

سر برآر و این قیامت درمیانِ خلق بیں!

یہ تو تھے ایک مفتی صاحب اور خیر سے جمعیت العلماء کے رکن (بایمہ ادعائے زہد و تقدس و دعوائے علم و فضل) اور دوسری طرف تھا ایک سیدھا سادہ مسلمان۔ جب اس کے کان میں یہ طاغوتانہ الفاظ پڑے تو جذبۂ حمیتِ اسلام سے تلملا اٹھا اور علی گڑھ سے للکار کر او! اسلام کو بربریت و سبعیت کا نظام کہنے والے سُن رکھ کہ "پاکستان کا نظریہ اس اصول پر مبنی ہے جو ہمیں اسلام نے سکھایا ہے۔ وہ اسلام جو

نہ صرف عدل و انصاف کی بلکہ غیر مسلموں سے کشادہ ظرفی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ (نوعِ انسانی ہونے کی جہت سے) ہمارے بھائی کی مانند ہیں۔" (مسٹر جناح کی تقریر علی گڑھ۔ بحوالہ ہندوستان ٹائمز ۱۱/۳ ۷)

وہ ہیں مفتی محمد نعیم اور یہ ہیں مسٹر جناح:

حسن ز بصرہ۔ بلال از حبش۔ صہیب از روم

ز خاکِ مکہ ابوجہل! این چہ بوالعجبی است

---

(۳) **ایک دلچسپ دلیل** سندھ کے وزیر۔ پیر الٰہی بخش صاحب نے "پاکستان" پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا:۔

"میرے خیال میں "پاکستان" ناقابلِ عمل ہے اور ہندوستانیوں کے لئے تقسیم ہو جانا اور اتحاد کو توڑ دینا خودکشی کے مرادف ہوگا۔ میں تو اقبال کے ان اشعار کا معتقد ہوں جن میں انھوں نے کہا ہے کہ

ہندی ہیں ہم۔ وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور

مسلم ہیں ہم۔ وطن ہے سارا جہاں ہمارا

جب ہم مسلمان ساری دنیا کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں تو ہم ہندوستان کے ایک حصّہ کو یہ کہہ کر کیوں چھوڑ دیں کہ یہ ہمارا وطن نہیں ہے۔" (مسلم وائس کراچی ۱۱/۳ ۱۵)

پاکستان کی مخالفت میں حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے ان اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا کس قدر دلچسپ ہے یعنی جناب پیر صاحب اقبال کے ان اشعار کو تو سند مانتے ہیں جو انھوں نے ۱۹۰۵ء میں کہے تھے۔ لیکن اسی اقبال نے جو کچھ ۱۹۳۰ء میں کہا اور جس کی وہ آخری وقت تک تلقین کرتے رہے اُسے سند نہیں مانتے!

یہ ہیں خیر سے ہمارے وزرا حضرات!

---

(۴) **ہذیان** جب انسان غیظ و غضب کے جوش میں اپنا عقلی توازن کھو بیٹھتا ہے تو اس وقت کس قسم کی باتیں کرنے لگ جاتا ہے، اس کا اندازہ اس مقالۂ افتتاحیہ سے لگ سکیگا جو پچھلے دنوں جناب فضل الحق صاحب

(وزیرِ اعظم بنگال) کے نوزائیدہ اخبار "نواجگ" میں شائع ہوا۔ اس مقالہ میں جس کا عنوان ہے "ہمارا لیڈر کون ہے" لکھا ہے :-

"ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ جناح کی مدد کیوں نہیں کرتے ؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم نے کبھی کسی ایسے شخص کو لیڈر نہیں مانا جو غیر بنگالی ہو۔ ہمارا پختہ ایمان ہے کہ صرف ایک بنگالی لیڈر ہی ہندوستان کو آزاد کرا سکتا ہے۔ ہمیں نہ جناح سے محبت ہے اور نہ اس کے خلاف کوئی تعصب ہے۔ جناح نے آپ کو کیا دیا ہے۔ پھر آپ جناح جیسے آدمی کی کیوں مدد کرتے ہیں جو ایک دوسرے صوبے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک گمنام ہستی ہے اور جس نے کوئی قربانی نہیں کی۔ کیا آپ کو اس پر کوئی شرم نہیں آتی۔ اگر آپ مجھے اس کی قربانی کی ایک مثال بھی بتا دیں تو میں اس کو اپنا لیڈر مان لونگا" (انقلاب ۵ اپریل)

ہمارا خیال ہے کہ اب جبکہ مسلم لیگ اور جناب فضل الحق صاحب کی افسوسناک آویزش کا دلخراش قصہ ختم ہو چکا ہے جناب فضل الحق صاحب کو چاہئے کہ اس اخبار کو بھی ختم کر دیں۔ اس لئے کہ یہ اخبار نہ صرف ان کے لئے اسی دنیا میں تخریب وتذلیل کا باعث ہوگا بلکہ آخرت میں بھی ندامت وشرمساری کا موجب بنے گا۔ جس اخبار کی بنیاد بنگالی مسلمان اور غیر بنگالی مسلمان کی تفریقِ جاہلیت پر ہو کسی سنجیدہ مسلمان کے لئے زیبا نہیں کہ اس سے کسی قسم کا بھی تعلق دابستہ رکھے۔

این دفترِ بے معنی غرقِ مےِ ناب اولیٰ

---

(۵) لاؤڈ اسپیکر اور نماز ہمارے دینی اجتماعات (مثلاً جمعہ۔ عیدین وغیرہ) میں آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کے استعمال کے جواز کا مسئلہ ایک عرصہ سے زیرِ بحث چلا آرہا تھا۔ للہ الحمد کہ اتنے عرصہ کی باہمی کشمکش اور تکفیر وتفسیق کے بعد مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی نے اب اس کے جواز میں فتویٰ صادر فرما دیا

صبح کا بھولا شام گھر آئے اس کو بھولا مت کہئے

ذیل میں سوال اور اس کا جواب (نقیب مورخہ ۱۰ اپریل) کے حوالہ سے درج کئے جاتے ہیں۔

" کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کثر اللہ سوادکم۔ اس آلہ کے بارے میں جسے ریڈیو کہتے ہیں۔ وہ

مثل فونوگراف ہوتا ہے جو اصواتِ خارجہ کو جذب کرکے نشر کر دیتا ہے۔ کیا اس کا استعمال نماز اور تلاوتِ قرآن میں جائز ہے، یا نہیں ہے۔؟ اور اس کے عمل کی صورت یہ ہے کہ قاری یا متکلم پڑھتا یا بولتا ہے اور وہ آلہ آواز جذب کرکے اسی کی آواز کی مانند نشر کرتا ہے۔ اور دونوں کی آواز میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ تو کیا بڑے اجتماع کی نمازوں میں مثلاً عیدین میں قرأت سننے کے لئے اس آلہ کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟"

(المستفتی محمد عبدالعزیز عفی اللہ از مدرسہ غوث العلوم واقع کمانی پورہ)

جواب:۔

جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ مگر سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسا آلہ ہے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اس کی طرف رُخ کئے ہوئے قرأت یا خطاب کرتا ہے۔ پس وہ آلہ آواز کو جذب کرکے اتنی دور نشر کرتا ہے کہ اس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی امداد کے آواز پہنچنا مشکل ہے اور جو آواز اس آلہ کے ذریعہ سامعین تک پہنچتی ہے وہ بعینہٖ قاری یا خطیب کے منہ سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے۔ یہ آواز قاری یا خطیب کے منہ کی کمزور نکلتی ہے، مگر وہ آلہ کے اندر ہوکر نکلتی ہے تو ہوا میں زیادہ قوت کے ساتھ نشر ہوتی ہے یہ آواز آلہ کی نہیں ہوتی۔ درحقیقت آلہ کی اپنی کوئی آواز ہے بھی نہیں۔ پس دور اور نزدیک جو بھی سننے میں آتی ہے وہ قاری یا خطیب کی آواز ہوتی ہے۔ کسی غیر کی نہیں ہوتی۔ اگر یہ تفصیل صحیح ہے تو ایسے آلہ کے استعمال سے کوئی حرج نہیں اور ہماری نظر سے شریعتِ مقدسہ میں اس کی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں گذری۔ واللہ اعلم۔

(محمد کفایت اللہ غفرلہٗ مدرسہ امینیہ)

ہمیں اس جواب سے تو اطمینان ہوا۔ لیکن لاوڈ سپیکر کے متعلق جناب مفتی صاحب کے اس بیان پہ بے حد حیرت ہوئی۔ اوّل تو آجکل لاوڈ سپیکر ایک اتنی عام چیز ہو چکا ہے کہ شہروں کے رہنے والے بچے بھی اس سے واقف ہیں۔ پھر جناب مفتی صاحب خود کانگرسی مولوی ہیں۔ انھوں نے کانگرس کے متعدد جلسوں میں شرکت کی ہے۔ جہاں التزاماً لاوڈ سپیکر نصب ہوتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ

انھوں نے خود کئی ایک مواقع پر لاؤڈ اسپیکر پر تقریر فرمائی ہوگی۔ اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو دو برس اُدھر دہلی میں خود جمعیت العلماء کا جو سالانہ اجلاس ہوا تھا اسمیں لاؤڈ اسپیکر موجود تھا اور ان تمام حضرات نے اس پر تقریریں کی تھیں۔ اس کے بعد مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ "جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہ دیکھنے میں نہیں آیا مگر سننے میں آیا ہے" (اور اس کے بعد پوری تفصیل لاؤڈ اسپیکر کی دی گئی ہے) یقیناً حیرت انگیز ہے۔ مستفتی صاحب نے اپنے استفتاء میں لاؤڈ اسپیکر کی جگہ ریڈیو کا غلط لفظ استعمال کر دیا ہے۔ لیکن ان کی تفصیل سے خود ہویدا ہے کہ ان کی مراد لاؤڈ اسپیکر سے ہے۔ (چنانچہ نقیب نے اس فتویٰ کو "لاؤڈ اسپیکر اور نماز" کے عنوان سے شائع کیا ہے) اس کے بعد مفتی صاحب کی طرف سے یہ تفصیلات اور قیود و شرائط سمجھ میں نہیں آسکیں۔ بہرحال ہمیں خوشی ہوئی کہ مفتی صاحب نے بات کو صاف کر دیا۔ اس کے بعد ہم بیرونی مقامات اور خود دہلی کی بڑی بڑی مساجد (مثلاً جامع مسجد۔ مسجد فتحپوری۔ عیدگاہ وغیرہ) کی مجالس منتظمہ سے درخواست کرینگے کہ وہ اب جمعہ اور عیدین کے اجتماعات پر لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کرنے کی فکر کریں۔ لیکن ہمیں تو اب بھی خدشہ ہے کہ خطیب حضرات اس پر بھی رضامند نہ ہونگے۔ اس لئے کہ لاؤڈ اسپیکر نصب کرنے کے بعد تقاضا ہوگا کہ سامعین تک کوئی کام کی بات پہنچائی جائے اور اس کے لئے قابلیت اور محنت دونوں کی ضرورت ہے۔ محض رسمی یا وراثتی خطابت و امامت سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ خطبات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کی مخالفت میں یہ جذبہ بھی بڑی حد تک کارفرما رہا ہے۔ ہم انتظار میں ہیں کہ آئندہ عید الضحیٰ کی تقریب پر کہاں کہاں لاؤڈ اسپیکر نصب کئے جاتے ہیں۔

---

(۶) حقیقی بہی خواہی

پنجاب کے مختلف حلقوں میں آجکل یہ خبر گشت لگا رہی ہے کہ وہاں کی اتحاد پارٹی کے خلاف ایک سازش ہو رہی ہے۔ جس میں ایک درجن کے قریب مسلمان بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ موجودہ اتحاد پارٹی کی حکومت کی جگہ ایک جدید پارٹی کی حکومت قائم کر دی جائے۔ اس پر اتحاد پارٹی کا حامی ایک اسلامی اخبار تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

" اگر یہ خبر درست ہے تو مسلمانوں اور صوبے میں منظم تعمیری کام کے حامیوں کا فرض ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ مسلمانوں کے جائز حقوقِ اکثریت اور صوبے کے قابلِ قدر تعمیری کاروبار کو گزند پہنچانے کے لئے کیا کیا سازشیں کی جا رہی ہیں .... اس قیاس کو درست مان لینے کی صورت میں (یعنی یہ کہ اس سازش میں مسلم لیگ کے کوئی سربر آوردہ صاحب بھی شامل ہیں) یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لیگ کے کسی ذمہ دار ممبر یا لیگ کی مجلس عاملہ کے ممبر کے لئے یہ زیبا ہے کہ وہ پنجاب میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کو چھوڑ کر جو سارے کے سارے لیگی ہیں کانگریسیوں اور اکالیوں سے ساز باز کرے۔ اگر یہ درست ہے تو کیا پنجاب میں اس پارٹی یا اس کے قائم کردہ نظام کو کسی نقطہ نگاہ سے بھی مسلمانوں کی نمائندہ پارٹی یا نمائندہ نظام قرار دیا جا سکے گا جس میں ۸۹ منتخب مسلم ممبروں میں سے ایک درجن کے قریب مسلمان شامل ہوں گے۔ "

مسلمانوں کے حقوق۔ لیگ کی سرفرازی۔ ملت کی مرکزیت۔ اجتماعی زندگی تشتت و افتراق سے احتراز۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کے متعلق ہمارا مسلک بالکل واضح ہے۔ لہٰذا ہمارے متعلق ایک ثانیہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ ہم کسی ایسی سازش یا تحریک کے حامی ہو سکتے ہیں جو لیگ کی نمائندگی اور ملت کی اجتماعیت و مرکزیت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی کا موجب ہو۔ ہم سے بڑھ کر ایسے شخص یا ایسی جماعت کا مخالف کوئی اور نہیں ہو سکے گا۔ لیکن ہم اس موقر جریدہ کی خدمت میں باوصف گذارش کریں گے کہ وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ذرا خدا کے لئے سوچیں تو سہی کہ کیا پنجاب کی موجودہ حکومت کو حقیقی معنوں میں مسلم لیگی اور مسلمانوں کی نمائندہ حکومت قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ مسلم لیگ اور اس کے نصب العین کی سب سے زیادہ ٹھوس (لیکن نقاب پوش) مخالفت آج پنجاب کی اس لیگی حکومت سے ہو رہی ہے؟ کیا حکومت پنجاب کے لیگی وزراء نے آج تک لیگ کی تقویت و استحکام کے لئے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ گاندھی جی کے سوراج کی طرح **سر سکندر حیات** خاں صاحب کے **نظریہ** پاکستان کی بھی

آج تک کوئی تعریف (Defintion) نہیں ہو سکی! ابھی کل ہی مسٹر منشی جیسے پاکستان کے متشدد مخالف نے کھلے کھلے الفاظ میں مسٹر جناح سے کہا ہے کہ سر سکندر حیات خان صاحب پاکستان کے مخالف اور اکھنڈ ہندوستان کے حامی ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۸ ۱۱/۴۱) اور سر سکندر کی طرف سے اس کی تردید میں ایک لفظ بھی شائع نہیں ہوا! اس کے برعکس سر سکندر حیات خان صاحب نے ابھی ابھی سونی پت کی تقریر میں اپنے اس پرانے نظریہ کو دہرایا ہے جس کے متعلق ہندوستان ٹائمز جیسے اخبار نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ "سر سکندر کی یہ اسکیم ہمیں تو منظور ہے لیکن کیا یہ مسلم لیگ کے نزدیک بھی قابلِ قبول ہو گی جس کا نظریۂ پاکستان اس سے بالکل جداگانہ ہے۔" (ہندوستان ٹائمز ۲۳ نومبر ۱۹۴۱ء) اور کیا یہ واقعہ نہیں کہ اتحاد پارٹی کی اس حکومت کے ایک وزیر (سر چھوٹو رام صاحب) نے اپنی زندگی کا نصب العین پاکستان کی مخالفت قرار دے رکھا ہے اور ان کے خلاف اس پارٹی یا لیگی حکومت کی طرف سے کبھی ایک آواز احتجاج کی بلند نہیں ہوئی ؟ کیا سر چھوٹو رام صاحب نے اکھنڈ ہندوستان کانفرنس (منعقدہ لدھیانہ) کو بذریعہ تار پاکستان کی مخالفت اور اکھنڈ ہندوستان کی موافقت کا پیغام نہیں بھیجا؟ (ہندوستان ٹائمز ۸ ۱۱/۴۱) کیا لیگی حکومت اسی کا نام ہے! کیا مسلمانوں کے حقوقِ اکثریت کا تحفظ اسی طرح ہوا کرتا ہے! کیا آج کوئی دیدہ ور پنجاب کی مسلم لیگ کو زندہ جماعت قرار دے سکتا ہے! کیا جب حالت یہ ہو تو ایسی جماعت کے تحفظ و بقا کے لئے مسلمانوں سے "حقوقِ اکثریت" اور نمائندگی لیگ کے نام پر اپیل کرنا کوئی وجہِ جواز اپنے اندر رکھتا ہے! یہ طرزِ عمل موجودہ حکومتِ پنجاب کی حقیقی بہی خواہی نہیں۔ حقیقی بہی خواہی یہ ہے کہ ان حضرات کو بتایا جائے کہ ان کی اس موجودہ "منکرے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن" کی روش سے مسلمان کس قدر بیزار ہیں۔ انہیں آگاہ کیا جائے کہ لیگ کی نمائندگی فقط لیگ کا لیبل چسپاں کر لینے سے نہیں بلکہ دل سے لیگ کے ساتھ رہنے میں ہے۔ انہیں کہا جائے کہ وہ جب تک مسلمانوں کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح نہ دیں گے مسلمان دل سے کبھی ان کے ساتھ نہ ہو سکیں گے۔ سازش کو ناکام بنانے کا یہ طریقہ ہے۔ نہ یہ کہ ۹۰ کے اعداد گن کر انہیں لیگ کی نمائندہ جماعت قرار دے دیا جائے۔ یقین مانئے۔ مسلمانوں کو نہ پنجاب کی موجودہ حکومت سے کسی قسم کا بیر ہے نہ اراکینِ حکومت سے کسی

قسم کی دشمنی - انھیں دشمنی اور اختلاف ہے تو اس طرزِ عمل سے جو ان حضرات نے لیگ کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ وہ اپنی روشن کو آج صحیح خطوط پر متشکل کر لیں مسلمان ان کے دست و بازو ہوں گے۔

باقی رہے مبینہ سازش کے عناصر۔ سو ان میں اگر کوئی لیگی حضرات بھی ہیں تو ہم ان کی خدمت میں گذارش کرینگے کہ وہ جو قدم بھی اٹھانا چاہیں لیگ کی منظوری اور جنابِ جناح کے مشورہ سے اٹھائیں۔ ان کا انفرادی فیصلہ خواہ ان کی دانست میں کتنا ہی ملتِ اسلامیہ کے مفاد کے لئے کیوں نہ ہو ملت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں، ہوگا تا وقتیکہ اس کے ساتھ مرکزی لیگ کی حمایت شامل نہ ہو۔

جوئے رواں

باسمہٖ

برادرِ مکرم - سلام مسنون

کون سا مسلمان ہے جو یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ اس کے لئے دین و دنیا کی گراں بہا متاعِ عزیز قرآن کریم ہے۔ لیکن کتنے مسلمان ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم انھیں زندگی کی کشمکش میں کون سی راہ دکھاتا ہے؟

کچھ عرصہ پہلے مسلمان کو اس کا احساس ہی بہت کم تھا کہ وہ معلوم کرے کہ قرآن کریم کس شاہراہِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن آج اس کا احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔

یہی وہ احساس ہے جس نے یہ خلش پیدا کی ہے کہ قرآن کریم کو سمجھا جائے۔ خلش پیدا ہو چکی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس خلش کی تسکین کا سامان میسر نہیں آتا۔

تسکین کے متلاشی چاہتے ہیں کہ زندگی کی عملی ضروریات اور دورِ حاضرہ کے پریشان کن مسائل کے متعلق کوئی بات اُن کے ذہن میں آئے۔ قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم۔ ایک مربوط۔ دلکش اور واضح مضمون کی صورت میں ان کے سامنے ہو جو اُن کی قلبی و ذہنی خلش کے لئے سکون اور رُوح کیلئے بالیدگی کا باعث بنے۔

یہی وہ احساس تھا جس سے متاثر ہو کر ہمارے محترم جناب **چودھری غلام احمد صاحب پرویز** نے آج سے قریب ۱۲ برس بیشتر ایک ایسے قرآنی انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کی ابتداء کی جس میں وہ سب کچھ ہو جس کی تلاش ہے اور عرصۂ دراز کی دماغ سوزی۔ دیدہ ریزی۔ جگر کاوی اور کوہ کنی کے بعد بتوفیقِ ایزدی اس

جوئے رواں

کو صحنِ گلستانِ ملت تک لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ یعنی جو مراحل آپ کو طے کرنے تھے وہ آپ کی خاطر

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

انھوں نے منضبط کر دیئے۔ چنانچہ ان کی محنت کا ماحصل اور تدبر فی القرآن کا نتیجہ یعنی اس عظیم المرتبت انسائیکلو پیڈیا

معارفُ القرآن

کی جلد اول چھپ کر سامنے آ گئی۔ کتاب کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کسی غائبانہ تعارف سے نہیں لگایا جا سکتا۔ کتاب دیکھنے سے ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ —— ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

جناب پرویز اپنے خداداد فہمِ قرآن اور دلکش اسلوبِ بیان کے لئے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہزارہا "مغرب زدہ" نوجوان ان کے گراں قدر مضامین کے تصدق مذہب سے والہانہ شیفتگی پیدا کر چکے ہیں جو ان کیلئے وجہِ سعادت اور ملت کے لئے موجبِ رحمت ہے۔

معنوی حیثیت کے علاوہ صوری حیثیت سے بھی کتاب جناب مؤلف کے حسنِ ذوق کی آئینہ دار ہے۔ بڑی تقطیع کے ۵۷۷ صفحات پر مشتمل۔ کتابت۔ طباعت۔ ٹائیٹل جنت نگاہ۔ کاغذ عمدہ، جلد خوبصورت مضبوط اور مُطلّا۔ مجلد کتاب کارڈ بورڈ کے بکس میں محفوظ —— اور قیمت:-

بلا جلد	پانچ روپے	محصول ڈاک ۱۳ر
مجلد	ساڑھے چھ روپیہ	محصول ڈاک ایک روپیہ

(ابتداء میں مجلد کی قیمت -/۸/۶ روپیہ تھی۔ لیکن جلد ساز نے دوسری مرتبہ اسی قیمت میں اس پایہ کی جلد تیار کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے جلد میں ۸ر کا اضافہ کرنا پڑا)

جلدی منگا لیجئے کہ ایسی کتابیں روز روز نہیں چھپا کرتیں۔

ملنے کا پتہ:- (۱) لاہور —— ملک رشید الدین صاحب۔ سپرنٹنڈنٹ پنجاب کوآپریٹو یونین لمٹڈ ٹورمال

(۲) نئی دہلی —— (۱) ۱۵ نور جہاں روڈ

(۳) دفتر طلوع اسلام۔ شمیم منزل پشیدہ بوزہ۔ قرول باغ دہلی

آپ کا بھائی

(آخوند زادہ) حسن امام ناظم ادارہ طلوع اسلام

ناشر معارف القرآن